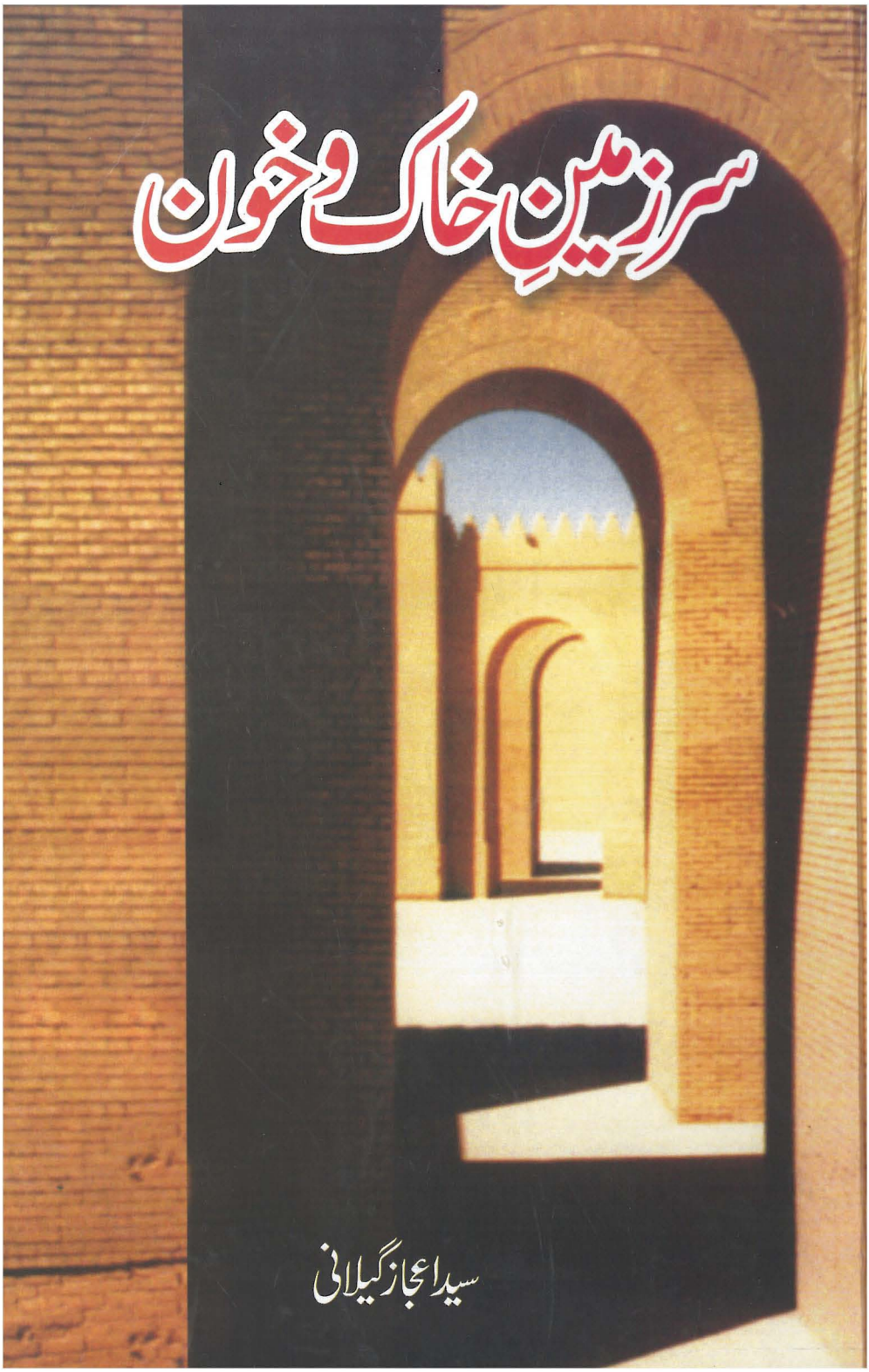
سرزمینِ خاک و خون
سید اعجاز گیلانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سرزمین خاک وخون

[سفرنامہ]

سیّد اعجاز گیلانی

طٰہٰ پبلی کیشنز

چوک اُردو بازار لاہور فون: 0333-4470509

اِس کتاب کا کوئی بھی حصہ طٰہٰ پبلی کیشنز سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا' اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتِ حال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔ (قانونی مشیر: فیاض احمد مہر ایڈووکیٹ ہائیکورٹ)

طٰہٰ

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : سرزمینِ خاک وخون
اشاعت اوّل : 2005ء
اشاعت دوم : جولائی 2022ء
ناشر : طٰہٰ پبلی کیشنز
سرورق : مجاہد چوہان
قیمت : 500 روپے
بیرون ملک : 15 ڈالر
زیر اہتمام: عوامی ثقافتی انجمن چونیاں ضلع قصور: قیصر سلمان غوری

اِنتساب

پیارے والدین کے نام!

اس اعتراف کے ساتھ کہ
میری زندگی کی ساری عزت، راحت اور تمام کامیابیاں ان کی دُعاؤں کے طفیل ہیں۔

اس دُعا کے ساتھ کہ
اللہ تعالیٰ مجھے ان کی خدمت کے قابل بنا دے اور وہ مجھ سے خوش ہو جائیں۔

فہرست

پیش لفظ 7
منفرد سفر نامہ 11
عرضِ سدید 13
زندگی اور لوگوں کا گہرا مطالعہ 19
خاص آدمی کے عام سفر کی روداد 25
برادرم اعجاز گیلانی 27
تہذیبوں کا گہوارہ 29
سفر وسیلہ ظفر 39
منیٰ بلوچستان 45
ایں دشمن است 49
اُونچی دکان، پھیکا پکوان 53
اصفہان کی چائے 56
شیریں فرہاد کی نہر 59
ایران میں اسلام آباد 62
بغداد آمد 64
الکاظمین اور الجوادین 68
غوث اعظمؒ سید عبدالقادر الگیلانی 75
بغداد میں مزارات 78
منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ 82
حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ 85
پرشکوہ قرآن گیلری 89
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ 91
موصل روانگی 98
سرمن رای (سامرہ) 102
عراقی عوام اور کشمیر 104
سگ بغداد کا تعاقب 106
علی بابا چالیس چور اور امریکی 108
بابل.....قدیم ترین تہذیب جسے پھر لوٹ لیا گیا 113
مقام خضر.....قدیم ترین عبادت گاہ 117
سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مزار پر حاضری 119
کوفہ کے چور 121
کربلا کا سفر 124
جب بغاوت کچلی گئی 127
جامعہ صدام کے طلباء سے ملاقات . 130
الوداعی ڈنر 132

عراقی پولیس کے ''کارنامے'' 135
ایران واپسی 138
آیت اللہ خمینی کے مقبرہ پر 142
تہران کا پی سی او 144
حمام عمومی اور حمام خصوصی 148
جمعہ بازار 151
چائے، چینی اور عزت افزائی 154
بچے دو ہی اچھے 157
امام رضا رضی اللہ عنہ کے مزار پر 160
ٹیکسی ڈرائیور کم ٹیچر سے ملاقات... 163
واپسی سے قبل خریداری اور ''سیخ پا'' 166
چڑیا فال اور خوشبو دار زیرہ 168
پاکستان زندہ باد کے نعرے 170
لاہور ریلوے اسٹیشن کا چیکر 172
عراق میں مزارات کا احوال 174
محلات کا مالک 191
عراق کی دلدل اور امریکہ 194
تاریخی معلومات سے بھرپور سفرنامہ 199
دلچسپ سفرنامہ 200

پیش لفظ

اچھی اور بُری قسمت صرف انسان کی زندگی کا حصہ ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ بعض خطہ ہائے ارض کے ساتھ بھی جڑی ہوتی ہے۔عراق کی سرزمین بھی ترقی وتباہی کی اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے جو اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں بستی و اُجڑتی رہی ہے۔ نئے عہد کا عراق میرے سامنے اپنی تہذیب وتمدن کی بے کراں تاریخ سفر کے دوران بکھیر رہا تھا۔ فلک بوس جدید عمارات سے مزین اس کے شہر اور صحراؤں میں زندگی کی تابناکیاں یہاں آنے والوں کو پُر جوش انداز میں خوش آمدید کہتی ہیں۔لیکن یہ کیا، گزرے ماہ وسال کی دھول ہٹتی ہے تو عراق، جس پر کبھی ہلاکو نے یلغار کی تھی اور اس کی تہذیب کو ملیامیٹ کر دیا تھا آج اسے امریکہ نئے عہد کا تاتاری بن کر تاراج کر رہا ہے۔ چند سال پہلے میں ایک وفد کے ساتھ صدام حسین کا عراق دیکھنے نکلا تھا۔ جن کے بارے میں بارہا سنا تھا کہ عراقی ایک منظم، حوصلہ مند اور پُر جوش قوم ہیں۔ ایران سے جنگ اور پھر 1991ء کی امریکی جارحیت کے بعد اس نے اپنے تن مُردہ میں اسی طرح جان ڈال لی تھی جیسے جاپان نے ناگاساکی اور ہیروشیما کی تباہی کے بعد دنیا میں ایک نئے جاپان کو جنم دیا تھا۔قوم حوصلہ مند اور راہنما پُرعزم ہو تو قوموں اور ملکوں کو نشاۃ ثانیہ کی طرف لوٹتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔آج کے عراق کو جب میں دیکھتا ہوں تو صدام کے محلات اور بابل ونینوا کے درمیان کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا۔ دونوں جگہیں ہی اتحادی بوٹوں تلے روندی جا رہی ہیں۔محلات پر فوج کشی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن نینوا کے گلی کوچوں میں بارود کے زخم کھائے جا بجا پڑے لاشے، امریکیوں اور غدار عراقیوں کے قدموں تلے سرزمین عراق کو پامال ہوتے دیکھتا ہوں تو پورے بدن میں خوف ویاسیت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

ہلاکو اور منگولوں نے تو دو مرتبہ بغداد میں خون کی ندیاں بہائی تھیں، تہذیب اور علم و حکمت کے خزانوں کو برباد کیا تھا لیکن گذشتہ دو دہائیوں سے امریکہ عراق کے لئے مسلسل ہلاکو ثابت ہوا ہے اور بے گناہ عراقیوں کو موت بانٹنے کے علاوہ معاشی پابندیوں سے ان کی زندگی جہنم بنا رکھی ہے۔ 1980ء میں ایرانی انقلاب کو ناکام بنانے کے لئے صدام حسین کی پیٹھ ٹھونکی گئی اور دیگر عرب ممالک کی مدد سے ایران پر جنگ مسلط کر دی گئی۔ 8 سال پر محیط اس جنگ میں 10 لاکھ سے زائد جانیں امریکی مفادات کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ اس کے بعد پھر صدام حسین کو ورغلایا گیا اور اسے کویت پر چڑھائی کی راہ دکھائی گئی۔ اس مہم جوئی کے نتیجہ میں خلیج میں عملداری اور قبضہ کا امریکی خواب پورا ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد امریکہ کو صدام حسین کی ضرورت نہ رہی تو پھر دہشت گردوں کی سرپرستی کے 'جرم' میں عراق کی سرزمین کو نشانِ عبرت بنا کر صدام حسین کو ہٹانے کا مشن ہزاروں لاشوں پر مکمل کر لیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود عراق اب تک سلگ رہا ہے، مزاحمت جاری ہے، خودکش حملوں میں امریکی و اتحادی فوجیوں کی لاشیں گر رہی ہیں اور اب تک ڈیڑھ ہزار سے زائد امریکی فوجی ہلاک ہو چکے ہیں باقی ممالک کے فوجیوں کی اموات الگ سے ہیں۔ قابض افواج کی نگرانی میں تشکیل پانے والی عراقی فوج اور پولیس بطور خاص مزاحمت کاروں کا نشانہ ہیں۔ لاقانونیت، عدم تحفظ، معاشی بدحالی اور بے یقینی کے سائے میں عراقی شہری اس آزادی کے منتظر ہیں جس کے نعرے لگا کر ''امریکہ بہادر'' نے دو سال قبل انہیں فتح کیا تھا۔

میں نے جس عراق کو دیکھا، محسوس کیا یہ اس عظیم اور بدقسمت سرزمین پر دو ''امریکی جارحیتوں'' جسے جنگوں کا نام دیا گیا، کا درمیانی عرصہ ہے۔ صدام حسین نے عراق کے صدر اور ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے تین دہائیوں سے زیادہ عرصہ گزارا۔ ان کی سخت گیری کے بارے میں مغربی میڈیا میں بہت کہانیاں شائع ہوتی رہی ہیں۔ صدام حسین نے اپنے مخالفین خصوصاً کردوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا۔ لیکن اس نے ملک میں جو سماجی، معاشی اور ترقیاتی نظام متعارف کروایا تھا اس کی بھی بہت سی خصوصیات تھیں۔ مگر آمریت بہرحال

آمریت ہوتی ہے۔ صدام حسین تو اب قید میں ہے اور مقدمات کا سامنا کر رہا ہے مگر اس وقت عراق جس داخلی عدم استحکام اور خانہ جنگی سے دوچار ہے۔ ایسے میں عراقی عوام کی بڑی تعداد کو صدام حسین کے دور کی یاد شدت سے ستاتی ہے جس کے وہ عادی بھی ہو چکے تھے اور موجودہ ''انارکی'' سے محفوظ تھے۔

میں نے ایک صحافی کی نظر سے اپنے وفد کے ساتھ سرزمین عراق کے علاوہ ایران کے بڑے شہروں میں بھی چند دن گزارے اور روزنامچے کی صورت میں اپنے محسوسات قلمبند کئے۔ اس روداد میں چند ایک جگہوں پر میں نے کچھ نئے حالات و امکانات بھی تحریر کئے ہیں جو ذاتی طور پر نہیں بلکہ بعض کرداروں کے حوالے سے ہیں۔ ممکن ہے آپ ان سے متفق نہ ہوں لیکن بحث، بہتری اور اصلاح کی گنجائش ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ عراق پر امریکی حملہ اور صدام حسین کی گرفتاری کے حوالے سے اخبارات میں شائع ہونے والے اپنے آرٹیکل بھی میں نے کتاب میں شامل کر دیئے ہیں تاکہ موجودہ حالات کی ایک جھلک سامنے آ سکے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے قابل ذکر مقدس مقامات کی تفصیل الگ سے بھی دی گئی ہے۔

مجھے احساس ہے کہ میرا شمار بہت اچھا لکھنے والوں میں نہیں ہوتا اور میں چونکہ سفرنگاری کے حوالے سے کسی سے متاثر بھی نہیں ہوں۔ اس لئے میں نے سیدھے سادھے انداز میں بغیر کسی مبالغہ آرائی اور ادبی چاشنی کے حالات و واقعات بیان کئے ہیں کیونکہ میری نظر میں عام فہم زبان ہی مؤثر ابلاغ کا ذریعہ ہوتی ہے۔

اپنے اس سفرنامہ میں عظیم المرتبت انبیائے کرام علیہم السلام، اہل بیتؓ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، بزرگان دین و اولیاء کرام رحمہم اللہ کا زیادہ ذکر کیا ہے۔ اگر آپ محسوس کریں اور سمجھیں کہ میں ان ہستیوں کے ذکر میں رتبہ، مرتبہ و مقام اور عظمت کے مطابق موزوں الفاظ کا انتخاب نہیں کر پایا تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔ اس سفرنامہ میں دیئے گئے تاریخی حوالہ جات، حقائق اور اعداد و شمار زیادہ تر عراق میں انگریزی میں دستیاب کتب اور پمفلٹ وغیرہ سے اخذ کئے گئے ہیں۔ دیگر جن اخبارات و جرائد سے معلومات کو بہتر اور مؤثر بنانے کی غرض سے مدد لی

ہے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

اپنے بھائیوں سید ارشد حسین گیلانی، سید افضال گیلانی، سید ابدال گیلانی اور ہمشیرہ ساجدہ اور عابدہ کے خلوص ومحبت اور احترام پر احسان مند ہوں۔ میری اہلیہ اور بچوں سیّد شہروز حسن، سیّد ضیاء الرحمٰن، اور سیّد حبیب الرحمٰن کی محبت اور تعاون میرا سرمایہ ہے۔

میں یہاں اپنے ماموں سید عباس علی شاہ گیلانی مرحوم ومغفور کا خصوصاً ذکر کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جو میرے استاد بھی تھے اور ان کے اعلیٰ علمی وادبی ذوق اور سرپرستی کی بناء پر مجھے تعلیم اور ادب وصحافت سے دلچسپی پیدا ہوئی اور زندگی میں آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت الفردوس عطا کریں۔ ان کے علاوہ ماہر تعلیم ریٹائرڈ ڈائریکٹر ایجوکیشن جناب محمد یعقوب ساجد صاحب جو اعلیٰ پائے کے نعت گو شاعر بھی ہیں کی ہائی سکول چونیاں کے دور میں اور جناب سعید بدر صاحب کی صحافت کے شعبہ میں رہنمائی اور حوصلہ افزائی کبھی نہیں بھول سکتا۔

مجھے یقین ہے کہ آپ مطالعہ کے بعد مجھے میری خامیوں اور کوتاہیوں سے ضرور آگاہ کریں گے تاکہ میں ان کی اصلاح کرسکوں۔ شکریہ!

سید اعجاز گیلانی

ejazgillani@gmail.com

منفرد سفر نامہ

سیّد اعجاز گیلانی کا زیرِ نظر سفر نامہ عام سفر ناموں سے یکسر مختلف ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس میں دلچسپی اور رنگینی کا مواد نہیں ہے ہے یا ان ملکوں کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کی گئی ہیں۔ اس کے برعکس ان کا یہ سفر نامہ ماضی قریب کے حالات اور واقعات کا آئینہ دار ہے اور ان دونوں ملکوں کی حقیقی تصویر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ سفر نامہ کو مزید معلومات آفریں بنانے کے لیے انھوں نے اس میں عراق کی تازہ صورتِ حال اور اس کی تاریخ کا تذکرہ کیا ہے۔ عراق جن مراحل سے گزرا ان کی تفصیل اس سفر نامے میں بہت سہل، عام فہم اور مؤثر انداز میں بیان کر دی گئی ہے۔ ان ممالک کے قدیم اور تاریخی آثار قدیمہ کا احوال اور تفصیل بھی قاری تک پہنچائی گئی ہے۔ انھوں نے اس سفر نامے میں جن شہروں میں قیام کیا وہاں کے عوام، رسم و رواج اور انداز فکر کے علاوہ بدلتے ہوئے طرز زندگی کا تذکرہ اس سفر نامہ کی نمایاں خصوصیات ہے جس کے باعث اس میں کسی قسم کی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔

سفر نامے کا نام انھوں نے ''سرزمینِ خاک وخون'' رکھا ہے جو اپنے اندر معنویت رکھتا ہے۔ ایران اور عراق کی تہذیبوں کو دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ وہ سر زمین ہے جہاں مغرور اور کج کلاہ شہنشاہوں کے تاج و تخت اُچھالے گئے۔ بیرونی حملہ آوروں نے ان علاقوں کو تخت و تاراج کیا۔ پھر جدید دور میں جو سیاسی اتھل پتھل اور خونریزی ہوئی اس نے اس سرزمین کو خون میں نہلا دیا۔ مقامِ حیرت ہے کہ ان ممالک نے ایک زمانے میں علم و حکمت اور ہنرمندی میں نمایاں مقام حاصل کیا تھا۔ مسلمان مفکروں اور سائنسدانوں نے حیرت انگیز ایجادات کی تھیں اور اس زمانے کے علم وفنون سے بے بہرہ یورپ کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ بے شمار صحابہ کرام، اولیائے کرام اور انتہائی بزرگ ہستیاں بھی یہاں آسودہ

خاک ہیں۔ اس کے باوجود انھیں تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑا۔ ان بزرگ ہستیوں کا سایہ بھی ان کے لیے سایہ عافیت ثابت نہ ہوا۔ آخر کیوں؟ اس کا جواب جاننے کے لیے خود اپنے اعمال اور کردار پر ایک نظر ڈالنا کافی ہوگا۔ اللہ کے حکم سے روگردانی اور نافرمانی کرنے والی اقوام کو بھی اللہ تعالیٰ نے تباہی سے دوچار کر دیا تھا اگر اس کے بعد بھی ہم عبرت حاصل نہ کریں تو اس میں قصور وار کون ہے؟

سیّد اعجاز گیلانی کا یہ سفرنامہ بہت سے ایسے سوالات کے جواب بھی فراہم کرتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ اپنی نوعیت کا منفرد سفرنامہ ہے۔

(علی سفیان آفاقی)

جناب علی سفیان آفاقی کا نام صحافت اور ادب کے حوالے سے محتاج تعارف نہیں۔ آپ متعدد اخبارات و جرائد کی ادارت کے علاوہ 1980 سے نوائے وقت کے ہفت روزہ فیملی میگزین کے ایڈیٹر ہیں۔ سفرنامہ اور فلم کے حوالے سے ان کی 27 کتب شائع ہو چکی ہیں۔

عرضِ سدید

سید اعجاز گیلانی کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جنہوں نے صحافت کو بطور قومی مشن اور اپنے داخل کی آواز پر قبول کیا اور اب تک اس کے ساتھ وفاداری بشرط استواری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ وہ ادارہ ''نوائے وقت'' میں میرے معاصر تھے۔ فرق یہ تھا کہ وہ اپنی جوانی کے زور پر اوپر کی منزل میں سیڑھیوں کے راستے جاتے جبکہ میں اپنی ضعیفی سے مغلوب ہو کر ''لفٹ'' استعمال کرتا۔ ہفت روزہ ''فیملی میگزین'' کے دفتر میں انہیں کام کرتے دیکھتا تو خوشی ہوتی کہ صحافت کی جس ایمپائر کو جناب مجید نظامی نے اپنے برادر بزرگ جناب حمید نظامی کی وفات کے بعد استوار کیا تھا، اس میں ایسے نوجوان بھی کام کر رہے تھے جن کے لئے سرکاری ملازمت میں کوئی کشش نہیں تھی اور جو ''نوائے وقت'' کے مشن کو آگے بڑھانے میں اس ادارے کے ساتھ وابستہ تھے۔ اعجاز گیلانی کی منفرد خوبی یہ تھی کہ وہ دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے اور حالات و واقعات سے اپنے نتائج خود اخذ کرتے۔ چنانچہ ان کی تیار کی ہوئی رپورٹیں اور تحقیقاتی فیچرز میں مشاہداتی عنصر نمایاں نظر آتا اور پڑھنے والے ان کی صدق بیانی سے گہرا تاثر بھی قبول کرتے تھے۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے قلم کو داخلی طور پر متحرک رکھنے کے لئے اپنے پاؤں کو بھی ہمہ وقت گردش میں رکھتے۔ سفر کو انہوں نے وسیلہ ظفر کبھی تسلیم نہیں کیا لیکن وہ سفر کو نادر معلومات حاصل کرنے، انوکھے تجربات سمیٹنے اور اشیا و مظاہر پر اپنی نظر ڈالنے کا ذریعہ ضرور سمجھتے ہیں۔ اس ترنگ کے تحت ہی وہ کچھ عرصہ قبل خشکی کے راستے ایران اور عراق کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ ان کا بنیادی مقصد تو مقامات مقدسہ کی زیارت کرنا ہی تھا لیکن ان کا سفرنامہ دیکھا تو احساس ہوا کہ وہ آنکھ کھول کر 'زمیں دیکھ، فلک دیکھ، جہاں دیکھ'' کا فریضہ بھی ادا کر رہے تھے۔

''سفرنامہ'' اُردو ادب میں اب ایک مستقل صنف ادب کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ قدیم سیاح نہ صرف مختلف ممالک کے عجائبات وغرائبات کو دیکھتے بلکہ ہر ملک کے جغرافیائی خدوخال اور تاریخی نوادرات کے علاوہ تہذیبی، سماجی اور معاشی کیفیات کو قلمبند کرنے کی سعی بھی فرماتے۔ موجودہ دور میں ہوائی جہازوں کی آمدورفت سے سفر آسان ہو گیا اور دنیا ایک ''گلوبل ولیج'' بن گئی ہے جس کے لمحے لمحے کی خبر ہمیں سیٹلائٹ اور کیبل نیٹ ورک سے ملتی رہتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سفر کی اتنی آسانیوں کے باوجود نوجوان اعجاز گیلانی نے ایران اور عراق کے سفر کے لئے زمینی وسائل اختیار کئے اور سفرنامہ لکھا تو اس میں صرف اپنے مشاہدات کا تذکرہ کیا اور اس میں آرائشی مواد شامل کرنے سے گریز کیا اور اس طرح انہوں نے اپنے سفرنامے کو نہ جلوۂ سراب بنایا اور نہ اسے نمود غبار کی مثال بننے دیا ہے۔ وہ زمین کے ساتھ چلتے اور ہر مقام سے اپنے تجربات سمیٹتے نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس مشکل سفر میں اعجاز گیلانی کا صحافی ہونا ان کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ اکثر مقامات پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب مشکلات ان کے راستے کی رکاوٹ بن جاتیں تو وہ ''آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا'' کے مصداق اپنے حواس مجتمع کرتے، اعصاب کو تازہ چائے سے توانائی عطا کرتے اور ''ہرچہ باداباد'' کہہ کر اگلے پڑاؤ کی طرف چل پڑتے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں جہاں کہیں ''خبر'' کی بو آ جاتی تو وہ رک جاتے اور اپنے اندر کے صحافی کو فوراً واقعے کی رپورٹنگ پر مامور کر دیتے۔ اس قسم کا ایک منظر حسب ذیل ہے:

> ''رات ڈیڑھ بجے بس ایک چیک پوسٹ پر رکی تو ہمارے سے پہلے دو بسیں وہاں کھڑی تھیں۔ باہر خاصی سردی تھی اور نوجوان سپاہیوں نے پہلے سے کھڑی ایک بس کے تمام مسافروں کو نیچے اتار کر قطار میں کھڑا کر رکھا تھا۔ خواتین کو البتہ نیچے نہیں اتارتے تھے۔ سڑک کے ساتھ ہی بڑی سی عمارت تھی۔ وہاں مسلح محافظ کھڑا تھا۔ باہر کی سرد ہوا سے بچنے کے لئے ایک ایرانی نوجوان نے اس عمارت کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہونا چاہا تو ایک سپاہی نے اسے منع کیا اور پرے

دھکیل دیا۔ وہ ایرانی نوجوان بھی غصے میں آ گیا اور ''تو تو میں میں'' کے بعد سپاہی نے اسے گریبان سے پکڑا اور ٹھڈے مارنے شروع کر دیے اور اٹھا کر جنگلہ نما گیٹ سے اندر دھکیل دیا۔ میں یہ منظر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا ہمیں بھی سردی میں نیچے اترنا پڑے گا؟ ہماری باری آئی تو ڈرائیور نے بتایا کہ مسافر پاکستانی ہیں اور اپنے کاغذات دکھائے تو نوجوان سپاہی نے تمام مسافروں پر نظر دوڑائی اور جانے کا اشارہ کر دیا۔

یہ واقعہ سفرنامہ نگار اعجاز گیلانی کو اصفہان کی سرحد پر پیش آیا۔ اس سے اولاً یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایران کی پولیس کا مزاج بھی پاکستان کی پولیس کے مشابہ تھا جو واقعے کی نوعیت پہچانے بغیر دھینگا مشتی پر اُتر آتی ہے۔ ثانیاً پاکستانیوں کے لئے ایرانیوں کی محبت بھی سامنے آتی ہے کہ جب پولیس ایرانی باشندوں کے ساتھ بدسلوکی کر رہی تھی تو سپاہیوں نے پاکستانی مسافروں کو احترام سے آگے جانے دیا۔

اعجاز گیلانی نے ایران عراق کا سفر اس زمانے میں کیا جب ان دو مسلمان ممالک کی جنگ ختم ہوگئی تھی، لیکن افراطِ زر اور اقوام متحدہ کی پابندیوں نے بڑوں بڑوں کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ دونوں ملک امریکی سازش کا شکار ہو چکے تھے اور بے روزگاری، اقتصادی بدحالی اور گرانی سے کراہ رہے تھے۔ خاص طور پر عراق جہاں 1991ء کی امریکی بمباری نے ملکی معیشت اور عوام کا بھرکس نکال دیا تھا۔ اعجاز گیلانی نے اس کیفیت کو عراق کے ایک بازار سے یوں پیش کیا ہے:

''بازار سے سڑک پر آنے سے تھوڑا پہلے بائیں جانب تھوڑی سی چیزیں رکھے ایک عورت بچہ گود میں لئے گھر کے ایک کمرہ کا دروازہ کھول کر دکان سجائے بیٹھی تھی اور ساتھ اس کی دس بارہ سال کی بیٹی تھی۔ ہم پاس سے گزرے تو عورت نے ہمیں اجنبی سمجھ کر غور سے دیکھا۔ میں نے ایک نظر اسے اور دوکان کو دیکھا تو مجھے ترس آ گیا کیوں کہ عورت اپنی گزر بسر کے لئے اتنی چھوٹی سی دکان بنا کر

بیٹھی تھی۔عراق میں المیہ یہ ہے کہ ہر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد جنگ میں ضرور کام آ چکا تھا۔کسی کا شوہر،تو کسی کا بھائی یا بیٹا۔عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہے۔ دکان سے چند قدم آگے گزرنے کے بعد میں نے قاسم اور عارف سے کہا''یار'' اس دکان سے کوئی چیز ہی خرید لو۔''چلو ان کی کچھ مدد ہو جائے گی۔'' ہم واپس آئے اور قاسم نے سامنے رکھے مغز نکالنے والے بیج کے لفافہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:''کم فی ہذا'' (اس کی کیا قیمت ہے؟) عورت اور اس کی بیٹی نے فوراً کہا''عشرہ خمسون''یعنی 25 دینار اور اس کے ساتھ ہی بچی نے شیشے کا ایک چھوٹا جار بھر کر دکھایا کہ اتنی مقدار ہوگی۔ہم نے سوچا کہ یہ بیج کافی سارے ہیں اور 25 دینار سے انہیں بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا کیوں کہ بغداد میں تو فقیر بھی 25 اور 50 دینار کو سیدھے منہ سے نہیں پکڑتا۔ میں نے انگلی کے اشارے سے کہا کہ''ایک دے دو''۔ بچی نے شیشے کے جار میں بیج بھرے اور پلاسٹک کے لفافہ میں ڈالتے ہوئے تھوڑے سے فالتو بیج بھی ڈال دیئے اور ایسا کرتے وقت اس کے چہرے سے خوشی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے بیج پکڑ کر 100 دینار کا نوٹ دیا تو میری دلی خواہش تھی کہ یہ 100 دینار ہی رکھ لیں مگر یہ خیال کر کے انہیں کہہ نہ سکا کہ کہیں یہ بُرا نہ مان جائیں کیوں کہ ہر انسان کی انا ہوتی ہے جسے وہ قائم رکھے تو ہاتھ پھیلانا تو دُور کی بات ہے کسی سے مفت میں ایک پیسہ بھی قبول نہیں کرتا۔عورت نے 75 دینار شکریہ ادا کرتے ہوئے ہمیں واپس کر دیئے۔''

یہ اقتباس قدرے طویل ہے لیکن اس سے جہاں عراق کی غربت کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں اس قوم کی خودداری کی صورت بھی سامنے آجاتی ہے۔ اس سے مصنف کی انسانی ہمدردی کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے جسے ہم باآسانی اپنی پاکستانی قومی فطرت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں جس کا نقش اعجاز گیلانی جگہ جگہ چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔تاہم جب وہ بغداد میں

مزار غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ پر فقیروں کے نرغے میں گھر جاتے اور اپنا سامان اور جان بمشکل بچا کر نکل آتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ عراق میں فقیروں کا رویہ بھی ان پاکستانی فقیروں جیسا ہے جو حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر لنگر کی تقسیم پر ٹوٹ کر یلغار کر دیتے ہیں۔

اس سفر نامے میں اعجاز گیلانی نے دو سطحوں پر سفر کیا ہے۔ وہ موصل، نجف، کربلا اور بغداد میں مقامات مقدسہ میں پہنچتے ہیں تو عقیدت اور محبت کے جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں اور ان کا ذوق وشوق تمام تر روحانی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ لیکن مزاراتِ عالیہ سے باہر آتے ہی زمینی حقیقتیں انہیں کچوکے لگانے لگتی ہیں اور اچھا کھانا، اچھی چائے، اچھے مشروبات کی ضرورت اشتہا کو اُبھارتی نظر آتی ہے۔ اوّل الذکر مقامات پر ان کا وطن پاکستان پس منظر میں اوجھل ہو جاتا ہے لیکن مؤخرالذکر مقامات پر وہ عراق اور ایران کا موازنہ پاکستان سے کرتے چلے جاتے ہیں اور وطن کی محبت دامن گیر ہو جاتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ سفر نامہ مذہبی احساسات اور دینی جذبات کی عکاسی کرتا ہے اور مقامات مقدسہ کی زیارت بھی اللہ تعالیٰ کا انعام نظر آتی ہے۔ زیارتوں سے ان کے دل و جان کو تسکین حاصل ہوتی اور روح فرحت محسوس کرتی ہے لیکن یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ بس کے ذریعے سفر مقدس آسان نہیں، خاصہ مشکل ہے جسے سفر کرانے والے ایجنٹ مزید مشکل بنا دیتے ہیں۔

میں نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا ''سفر حجاز''، شبلی نعمانی کا سفر نامہ ''مصر روم و شام''، بیگم ہمایوں مرزا کا سفر نامہ ''عراق''، شورش کاشمیری کا ''شب جائے کہ من بودم''، غلام الثقلین نقوی کا ''ارض تمنا''، ممتاز مفتی کا ''لبیک'' اور حج و زیارات کے متعدد سفر نامے پڑھے ہیں۔ ان سفر ناموں میں ہر زائر نے اپنے دل کی کیفیات اور روحانی تجربات بیان کرنے کی کاوش کی ہے اور پڑھنے والوں کا دل موہ لیا ہے۔ سید اعجاز گیلانی نے بھی اس سفر نامے میں افقی اور عمودی دونوں سمتوں میں سفر کیا ہے اور صحافی ہونے کے ناطے سے ان کے سفر نامے میں ''خبریت'' کا عنصر نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور قاری ان کے سادہ اسلوب میں لطافت اور

جاذبیت محسوس کرتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ انہوں نے یہ سفرنامہ لکھتے وقت اپنے ذہن کی سطح پر ایران وعراق کے ان تمام مقامات کا سفر دوبارہ کیا جنہیں وہ عرصہ پہلے دیکھ کر ماضی کا حصہ بنا آئے تھے۔ میں نے یہ سفرنامہ پڑھا تو یوں محسوس ہوا جیسے ان کے ساتھ سفر کر رہا ہوں اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت سے اپنی روح کو سبکسار کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر انور سدید

ستلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

جناب ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ گذشتہ 18 سال سے ملک کے معروف روزناموں کے شعبہ ادارت میں فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ آج کل روزنامہ ''نوائے وقت'' کے لئے کام کر رہے ہیں۔ بے شمار کتب کے دیباچے تحریر کرنے کے علاوہ آپ کی متعدد علمی وادبی وتحقیقی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ترجمہ، تجزیہ، اداریہ اور کالم نویسی آپ کے خصوصی شعبے ہیں۔

زندگی اور لوگوں کا گہرا مطالعہ

عزیز القدر سید اعجاز گیلانی دو تین ماہ سے اپنی کتاب (سفرنامہ) کا دیباچہ لکھنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ جس کے لئے ہم گریزاں رہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہم سرے سے اس قابل ہی نہیں کہ دیباچہ جیسی اہم چیز لکھ سکیں۔ ہمارے خیال میں کسی کتاب کا دیباچہ صرف ایسی شخصیت ہی تحریر کر سکتی ہے جو علم و ادب اور حکمت و دانش کے میدان میں بلند مقام کی حامل ہو جسے کم از کم اس موضوع پر پورا عبور اور مکمل دسترس حاصل ہو جس موضوع میں مذکورہ کتاب لکھی گئی ہو لیکن ہم میں ایسی کوئی خوبی نہیں۔ فارسی کا مقولہ ہے کہ ''من آنم کہ من دانم'' یعنی جو کچھ میں ہوں، میں ہی جانتا ہوں یا پھر اُردو میں اس مفہوم کو یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ ''کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ''۔

اس سلسلہ میں ہمیں ممتاز شاعر اثر صہبائی کا واقعہ یاد آتا ہے ہم نے یہ واقعہ ان کی نعتیہ کتاب کے دیباچہ میں پڑھا۔ یہ دیباچہ نامور قانون دان اور پنجاب ہائیکورٹ کے (سابق) چیف جسٹس ایم آر کیانی (محمد رستم کیانی) نے لکھا ہے۔ کیانی صاحب ماہر قانون ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ انہوں نے جنرل محمد ایوب خاں کے مارشل لاء کے دور میں سخت اور شدید پابندیوں کی فضا میں ایسے ''انداز'' میں مضامین لکھے جن پر لوگ عش عش کر اُٹھے۔ جنرل ایوب خاں کو ان کے خلاف کارروائی کی جرأت نہ ہو سکی۔

ایم آر کیانی، اثر صہبائی کے نعتیہ مجموعہ کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:

''مجھے نہیں معلوم! کہ جناب اثر صہبائی میرے پاس اپنی کتاب کا دیباچہ لکھوانے کیوں آئے ہیں کیونکہ میں سکہ بند ادیب ہوں اور نہ ماہر فن۔ میرا تعلق تو صرف

قانون سے ہے۔''

پھر لکھتے ہیں:

''اس کی تین وجوہات ہوسکتی ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میں صوبہ سرحد کے جس علاقہ یعنی کوہاٹ سے تعلق رکھتا ہوں، اسی علاقہ سے معروف پشتو ادیب خوشحال خاں خٹک کا تعلق تھا، اس لئے وہ سمجھے کہ شاید میں بھی ادیب ہوں حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ خوشحال خاں خٹک کے گاؤں کے درمیان ایک آبی نالہ بھی بہتا تھا جو دونوں کو جدا کرتا تھا۔ دوسری وجہ مجھے بھول گئی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ (سابق) چیف جسٹس ایس اے رحمان کی ریٹائرمنٹ کے بعد میں ہائیکورٹ کا چیف جسٹس بنا اور وہ ماہر قانون ہونے کے ساتھ ادیب اور شاعر بھی تھے۔ اس لئے اثر صہبائی سمجھے کہ میں نے چونکہ وہی سیٹ سنبھالی ہے جس پر ایس اے رحمٰن فائز تھے اس لئے میں ادیب بھی ہوں حالانکہ میرا ادب سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔''

آخر میں لکھتے ہیں:

''تیسری وجہ بھی یاد آ گئی اور وہ یہ ہے کہ اگر میں ان کی کتاب کا دیباچہ لکھ دوں تو ممکن ہے کہ ادیبوں کی صف میں میرا نام بھی شامل ہو جائے گا میرے خیال میں یہی وجہ قرین قیاس ہے۔''

ہمارا حال بھی جسٹس ایم آر کیانی جیسا ہے چونکہ کبھی کبھار ''دو چار اکھر'' لکھنے کا موقعہ ملتا رہا ہے جو اخبارات و جرائد کی زینت بنتے رہے، اس لئے اعجاز گیلانی نے تصور کر لیا کہ ہم بھی شاید کوئی بہت بڑے ادیب ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمارے خیال میں یہ محض ان کا حسن ظن ہے۔ البتہ یہ بات زیادہ درست اور قرین قیاس ہے کہ وہ چاہتے ہوں کہ ان کی کتاب کا دیباچہ لکھ کر ہم بھی ان ادیبوں میں شامل ہو سکتے ہیں جو دیباچہ نویس ہوتے ہیں چلئے اس طرح ادیبوں میں شمولیت ہو جائے گی خواہ ادیبوں کی آخری قطار میں باری آئے

اور ہمارا نمبر سب سے آخر ہی میں کیوں نہ ہو۔

دیباچہ لکھنا ایک فن ہے اور سچی بات ہے کہ بہت ہی مشکل فن کیونکہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ دیباچے میں کتاب کی صرف خوبیاں، اچھائیاں اور اوصاف ہی لکھے جائیں۔ اگر آپ نے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کر دی یا منفی پہلو بیان کر دیئے تو آپ ایک اچھے دوست سے محروم ہو جائیں گے اور ستم بالائے ستم یہ کہ یہ دیباچہ کتاب کی زینت نہیں بنے گا۔ ہمارے ایک کرم فرما کوکب نورانی ہیں، وہ ہمارے ایک اور کرم فرما صبیح رحمانی کے ''نعت رنگ'' پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں اور یہ ''نگاہ'' اتنی ''تیز'' ہوتی ہے کہ ہر مضمون نگار کی تحریر کا ''کچا چٹھہ'' بیان کر دیتے ہیں اور ایسی ایسی دلیلیں لاتے ہیں کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور انہیں تسلیم کئے بغیر چارۂ کار نہیں رہتا۔ ان کا کہنا ہے کہ اول تو ہم سے کوئی دیباچہ لکھواتا نہیں اور اگر لکھوا لیتا ہے تو چھاپتا نہیں کیونکہ ہم محاسن کے ساتھ عیوب بیان کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ کسی کی کتاب پر دیباچہ بہت کم لکھتے تھے۔ ہماری معلومات کے مطابق انہوں نے ممتاز مصور عبدالرحمٰن چغتائی کی کتاب کا دیباچہ لکھا جو مصور دیوان غالب کی صورت میں شائع ہوئی۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ فرمایا ہے ؎

مطلع کونین راہ دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ دونوں جہانوں یا کائنات کو مطلع یا کتاب تصور کر لیا جائے تو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے (خوبصورت) دیباچہ کی حیثیت حاصل ہے اور یہ تمام جہان اس کے بندوں اور غلاموں پر مشتمل ہے۔ یہ دیباچہ خود اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے۔ اس عمدہ و حسین دیباچے کے بعد باقی تمام ہیچ ہیں اور ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

عزیزم اعجاز گیلانی کی کاوش ''سرزمین خاک و خون'' دراصل دو پڑوسی ممالک کے

سفرنامہ پر مشتمل ہے۔ سفرنامہ ادب کی تمام صنفوں سے بالکل الگ ادبی صنف ہے جس کا علیحدہ اسلوب اور الگ طرز نگارش ہے۔ ہر سفرنگار نے سفرنامہ لکھتے وقت اپنا اپنا الگ انداز تحریر اختیار کیا ہے۔ بعض لوگ جنہیں افسانوی ادب سے دلچسپی ہوتی ہے وہ اس میں افسانوی رنگ ضرور شامل کر دیتے ہیں اور جن کا ادب عالیہ سے تعلق ہوتا ہے وہ اس میں ادب کی چاشنی شامل کر دیتے ہیں۔ بہرحال ایسے لوگوں کے سفرنامے اعلیٰ ادب کی مثال پیش کرتے ہیں جن میں علامہ شبلی نعمانی کا سفرنامہ مصر و شام اور مختار مسعود کے سفرنامہ ایران کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مستنصر حسین تارڑ اپنے سفرناموں میں افسانوی انداز اختیار کرتے ہیں اور حسن و عشق کی کہانی ضرور لے آتے ہیں۔ یہی حال عطاء الحق قاسمی کا ہے جنہیں ہر سفر میں ایک حسین و جمیل لڑکی ضرور مل جاتی ہے جو ان سے عشق کرنے لگتی ہے یا پھر یہ اس سے دل ہی دل میں عشق ضرور کرتے ہیں تاہم ان سفرناموں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سفرنامے مقبول ہوئے۔

ماضی میں نظر ڈالیں تو ابن بطوطہ کا سفرنامہ بہت شہرت کا حامل ہے جس نے اپنے سفر میں شامل ہر ملک کے حالات و واقعات، معیشت، معاشرت، سیاسی حالات، تہذیب و تمدن، غرضیکہ ہر چیز تفصیل سے بیان کر دی ہے۔ اسی طرح ابوریحان البیرونی کا ''سفرنامہ ہند'' معرکۃ الآراء حیثیت رکھتا ہے جس میں اس نے ہندوستان کے لوگوں کا طرز تمدن، طرز بود و باش، طرز حیات اور طرز حکومت حتیٰ کہ سب کچھ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے دین و مذہب کے بارے میں ہندوؤں کے مخصوص عقائد و خیالات بھی تحریر کر دیئے ہیں۔

البیرونی نے ہندوؤں کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے لئے ان کی زبان سنسکرت نہ صرف سیکھی بلکہ اس میں مہارت بھی حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا سفرنامہ اس دور کے ہندوستان کی حقیقی اور واضح تصویر پیش کرتا ہے جو آج بھی گراں قدر تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

ہمارے ضابطہ حیات قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ:

﴿ وَ قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ﴾

''اور اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان لوگوں سے کہہ دیجئے! کہ زمین کی

سیر کیا کریں۔''

گویا قرآن حکیم نے بھی حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سرزمین پر گھومو، پھرو، سیر کرو اور پھر اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو غور سے دیکھو اور ان سے عبرت حاصل کرو، زندگی کے مشاہدات و تجربات سے استفادہ کرو۔

اس سلسلہ نبی رحمت اور رسول کریم و عظیم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معراج کا سفر بہت اہمیت کا حامل ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق ''اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو آسمانوں کی سیر کرائی اس کی تفصیل قرآن پاک میں موجود ہے۔ معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ رسول رحیم و کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعثت سے قبل یمن، شام و فلسطین اور عراق کے علاقوں کے تجارتی سفر کئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں نے فتوحات کے سلسلہ میں مشرق و مغرب کے سفر کئے۔ جنگیں بھی سفر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی ضمن میں محمد بن قاسم کا حملہ سندھ، طارق بن زیاد کا حملہ ہسپانیہ و دیگر مسلمان فاتحین کے ایران سے آگے ماوراء النہر، آذربائیجان اور اقصائے چین تک کے حملے سفر جیسی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ مسلمانوں نے عرب سے نکل کر ہندوستان، سراندیپ (موجودہ سری لنکا)، بنگال، برما، انڈونیشیا حتیٰ کہ فلپائن اور چین تک کے تجارتی سفر کئے۔ چین میں حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کا مقبرہ اب تک موجود ہے اور عربوں کی آمد کی بین دلیل ہے۔ فلپائن میں مسلمانوں کی کافی تعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرب مسلمان یہاں تک پہنچے۔

تجارتی اسفار اور جنگی حملوں کے علاوہ صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین نے تبلیغی سفر کئے اور لوگوں کو اسلام کی دولت سے مالا مال کیا۔ ہندوستان میں حضرت یعقوب زنجانی، سید علی ہجویری، سید معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہم اور ان جیسے دیگر سینکڑوں بزرگانِ دین شامل ہیں۔ ان تمام لوگوں کا ذکر کیا جائے تو داستان طویل ہو جائے گی۔

بہر حال اعجاز گیلانی کا سفرنامہ منفرد حیثیت کا حامل ہے انہوں نے اپنے سفرنامہ کو زیادہ

پھیلانے سے گریز کیا ہے۔ دراصل اس کی وجہ بنیادی طور پر ان کا صحافت کے پیشہ سے تعلق ہے جس میں زیادہ سے زیادہ مواد کو تھوڑے سے تھوڑے مواد پر مبنی ''خبر'' کی صورت دینا ہوتی ہے۔ اس لئے اپنے سفرنامہ میں وہ ہر جگہ 'محتاط' نظر آتے ہیں اور تفصیلات بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں تاہم وہ نہایت عمدگی سے اپنی ''اصل بات'' کہہ جاتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنا سفرنامہ لکھتے وقت ایران وعراق پر لکھے گئے پہلے سفرناموں کو نہ پڑھا ہے اور نہ ان کو سامنے رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ''نقالی'' سے بچ گئے ہیں اور یہی ان کے سفرنامہ کا نکتہ عروج ہے جو انہیں عہد حاضر کے بعض دوسرے سفرنامہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔

ان سے ہمارا تعلق کم وبیش پندرہ بیس سال پر محیط ہے وہ بہت تیز نگاہ اور ذہین، نوجوان ہیں۔ زندگی کے متعدد شعبوں کے شناور ہیں، وہ ادیب بھی، صحافی بھی اور سماجی کارکن بھی ہیں۔ بہرحال انہوں نے زندگی اور لوگوں کا قریب سے گہرا مطالعہ کیا ہے اس لئے ان کی جملہ بازی، گہرے تجربہ ومشاہدہ کی مظہر ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا اور محسوس کیا ہے کہ دوستوں کے دوست، ملنسار اور ہمدرد وغمگسار انسان ہیں۔ حب الوطنی اور اسلام دوستی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وطن پر آنچ آئے تو تڑپ اُٹھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں زندگی میں مزید کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار کرے اور علم وادب میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

سعید بدر

965۔ نظام بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

جناب سعید بدر ممتاز صحافی، ادیب، ماہر اقبالیات اور نعت نگار ہیں۔ واپڈا میں بطور پی آر او اور خبرناموں کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے علاوہ گذشتہ چالیس سال سے ان شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ متعدد اخبارات وجرائد میں بطور ایڈیٹر کام کیا ہے۔ روزنامہ ''امروز'' اور صحافت کے میگزین ایڈیٹر بھی رہے۔

مختلف موضوعات پر آپ کی پانچ کتب شائع ہو چکی ہیں اور متعدد زیر طبع ہیں۔ متعدد سماجی تنظیموں کے عہدیدار بھی ہیں۔ ان کی نعتوں کی کتاب ''عرض تمنا'' کو صدارتی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

خاص آدمی کے عام سفر کی روداد

یہ ایک خاص آدمی کے عام سفر کی روداد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بظاہر سید اعجاز گیلانی، اخبار نویس ہے، میڈیکل کے شعبہ سے وابستہ ہے اور فلاحی تنظیموں سے بھی تعلق جوڑے ہوئے ہے۔ وہ عام آدمی کی طرح زندگی کا لطف اٹھانے پر آمادہ رہتا ہے۔ جب انھوں نے اپنے سفر نامہ کا مواد میرے سپرد کیا تو یہی سوچ ہمارے ذہن میں تھی کہ بظاہر بہت سے شعبوں سے جڑا خاص سیّد اعجاز گیلانی سفر کے دوران کیا صورت اختیار کرتا ہے کیوں کہ حضرت علیؓ کا قول ہے ''سفر کسی کو پہچانے کا ایک ذریعہ ہے'' لیکن جیسے جیسے مسودے کے اوراق پلٹتا گیا اعجاز گیلانی عام مسافر کی طرح سفر کی سہولتوں اور پریشانیوں سے الجھتا اور لطف اندوز ہوتا نظر آیا۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز میں میں نے اسے ایک خاص آدمی کے عام سفر کی روداد لکھا ہے۔

ایران عراق بائی روڈ سفر پاکستانیوں کے لیے نیا نہیں۔ خاص طور پر زیارتوں پر جانے کے لیے پاکستان کے وفود سارا سال ہی سفر میں رہتے ہیں۔ زیارتوں کے سفر پر جانے والے کئی زائرین نے اپنے جذبات واحساسات اور خیالات کے اظہار کے لیے سفر نامے لکھے ہیں لیکن ان سفر ناموں میں عام طور پر ظاہر کی آنکھ بند کر کے باطن کے ذریعے سفر نگار محوِ سفر نظر آتے ہیں۔ عقیدت کے جذبات میں لتھڑے ان سفر ناموں کو پڑھ کر جب لوگ رختِ سفر باندھتے ہیں تب انھیں معلوم پڑتا ہے کہ دیدار کا لطف اُٹھانے کے لیے سنگریزوں پر بھی چلنا پڑتا ہے۔ یہ وہی سنگریزے ہیں جنھیں سفر نگار عقیدت کی مٹی میں چھپا دیتے ہیں۔ لیکن سیّد اعجاز گیلانی چونکہ حقیقت پسند صحافی ہے اس لیے عقیدت کے مراحل میں بھی حقیقت کی روشنی اور جاننے کا کرب اس کے سفر نامے میں مسلسل جھلکتا نظر آتا ہے۔

غوث الاعظمؒ کے مزار سے واپسی پر فقیروں کے چنگل سے نیاز کے چاول مہارت سے بچالانے پر مسرور نظر آتا ہے تو دوسری طرف وہ مزاروں کی حالت زار اور وہاں زائرین کی کمی پر کڑتا بھی نظر آتا ہے۔

اعجاز گیلانی نے سفرنامہ کو باطنی رنگ دینے سے احتراز کیا ہے۔ ساتھ ہی الفاظ و تراکیب کے بے جا استعمال سے بھی گریز کیا ہے۔لیکن سیدھے سادھے انداز اور سفر کے دوران پیش آنے والے مختلف دلچسپ واقعات کی بدولت قاری پر اپنی گرفت برقرار رکھتا ہے اور وہ خود کو اسے ایک ہی نشست میں پڑھنے پر مجبور پاتا ہے۔

اعجاز گیلانی کا یہ سفرنامہ دنیائے ادب کی کوئی عظیم تحریر نہیں لیکن سادہ تحریر ضرور ہے اور چینی کہاوت ہے عظیم تحریر ہمیشہ سادہ الفاظ میں لکھی جاتی ہے۔

(ظہیر احمد بابر)

جناب ظہیر احمد بابر نوجوان صحافی اور میڈیا پلانر ہیں۔ روزنامہ دن،نوائے وقت ۔ ایکسپریس،الشرق، ڈان ،دنیا میں اہم عہدوں پر کام کرنے کے بعد بعد آج کل نیوٹی وی اور نئی بات میں ایگزیکٹو ڈائریکٹر نیوز اور جز وقتی کالم نویس بھی ہیں۔ان کی 3 کتب شائع ہو چکی ہیں جن میں سے ''پارلیمنٹ سے بازار حسن تک'' نے خوب شہرت پائی۔

برادرم اعجاز گیلانی

انبیائے کرام، صحابہ اور اولیاء کی زندگی کا بنیادی مقصد رضائے الٰہی کا حصول اور سماجی بہبود رہا ہے یہی ان کا مشن اور پیغام تھا۔ ایران، عراق اور شام میں مقبولان بارگاہِ الٰہی کی بہت مقدس نشانیاں موجود ہیں جن کی برادر محترم سید اعجاز اختر گیلانی نے وہاں حاضر ہو کر زیارت کی۔ ان علاقوں کی سیاحت کے علاوہ سیاست، ثقافت، صحافت، لطافت و نظامت کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا۔

اعجاز گیلانی کوئی کل وقتی پیشہ ور صحافی یا قلمکار نہیں بلکہ والدین کی دعاؤں اور میرے پیرومرشد قبلہ سید عباس علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم و تربیت کا فیضان ہے کہ جب گورنمنٹ ہائی سکول چونیاں میں زیر تعلیم تھے تو ایک ادبی تنظیم گلستان ادبی سوسائٹی کے نام سے شروع کی اور ادبی مجلّہ گلستان کے نام سے جاری کیا۔ اس کی ترویج و اشاعت میں گھر سے ملنے والے جیب خرچ کے علاوہ مڈل سٹینڈرڈ امتحان کا وظیفہ بھی لگا دیا اور کالج میں مختلف ادبی تحریکوں کے روحِ رواں رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علاقہ کی فلاح و بہبود کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ اعجاز جہاں اُردو خوبصورت لکھتے ہیں وہاں انگریزی سے بھی گہرا شغف ہے۔ وہ معروف انگریزی روزنامہ سے بھی وابستہ رہے۔ قومی اخبارات و جرائد اور کالج میگزین میں ان کی تحریریں پرورش لوح و قلم کرتی رہیں۔ انہوں نے ایک میگزین ماہنامہ ''ساحل رنگ'' کے نام سے جاری کیا جسے عوامی سطح پر پذیرائی ہوئی جو تا حال عوامی ثقافتی انجمن چونیاں کے تعاون سے شائع ہو رہا ہے۔ جس کے ذریعے وہ تعمیری اور بامقصد ادب کی تخلیق و ترویج میں کوشاں رہے ہیں۔ اچھا بولتے اور اچھا کھیلتے ہیں۔ ہاکی اور کرکٹ سے بہت لگن ہے الاویس ہاکی

کلب اور افتخار شہید کرکٹ کلب کے بانی ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ہاکی میں اپنے کالج کی طرف سے متعدد بار نمائندگی کر چکے ہیں جبکہ لکھنے اور کھیلنے پر کئی انعامات اور اعزازات بھی رکھتے ہیں۔ انہی خدمات کے پیش نظر ریڈیو اور پی ٹی وی کے پروگراموں میں اپنے علاقہ کی نمائندگی کرتے ہوئے چونیاں کا نام روشن کیا۔

قارئین کرام! اعجاز گیلانی کی یہ کتاب اس وقت منظر عام پر آ رہی ہے جب یہ دیارِ غیر جانے کی تیاریوں میں ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ لکھنے کا سلسلہ وہاں بھی جاری رکھیں گے اور زندگی کے نئے زاویے سامنے لائیں گے۔ بارگاہ الٰہی میں دعا ہے کہ صدقہ مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے بھائی اور آپ کے دوست اعجاز گیلانی کو دارین کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ (آمین بحرمت سید المرسلین وآلہ وسلم)

دعا گو!

سید ارشد حسین گیلانی

جنرل سیکرٹری انجمن اساتذہ پاکستان پنجاب

معلم ادبیات گورنمنٹ ہائی سکول چھانگا مانگا

تہذیبوں کا گہوارہ

سرزمین عراق میں آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران گم گشتہ تہذیب کے حامل دنیا کے دو عظیم شہر بابل اور نینوا آباد سے برآمد ہونے والی اڑھائی ہزار سال قبل مسیح کی لوح پر یہ تحریر کندہ تھی:

وہ گھر جہاں اندھیرا ہے
جس میں داخل ہونے والا کبھی باہر نہیں نکلتا
جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں
وہ مکان
جس میں روشنی کا گزر نہیں
اور جہاں لوگ دھول پھانکتے اور کیچڑ کھاتے ہیں
اور جہاں دروازوں اور روشن دانوں پر گہری گرد جمع رہتی ہے

دونوں شہروں بابل اور نینوا کے درمیان اگرچہ تین سو میل کا فاصلہ ہے لیکن یہ عظیم اور پرشکوہ مملکتیں دریائے دجلہ اور فرات کے ایک ہی خطے میں پروان چڑھتی تھیں۔ زمانہ قدیم میں یہ عاد کہلاتا تھا۔ آج اس میں بغداد، سامرہ، کربلا، نجف اشرف، کوفہ اور کئی دوسری بستیاں آباد ہیں۔ ان میں سے ہر بستی کے پس پردہ عروج وزوال کی ایک طویل داستان بکھری ہوئی ہے۔ ماہرین ارض سرزمین عراق کو تہذیبوں کا گہوارہ قرار دیتے ہیں جہاں تہذیبیں پروان چڑھنے اور برباد ہونے کے آثار باقی ہیں۔

اس سرزمین میں صدیوں پر محیط تاریخ میں شورشوں اور ہلاکتوں کا ذکر وقفے وقفے سے ملتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ طوفان نوح علیہ السلام سے لے کر کربلا اور کربلا سے 2003ء

کے امریکی حملہ و قبضہ تک یہ سرزمین خاک وخون میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہے۔

بقول ماہرین ارض سرزمین عراق سے جنم لینے والی تہذیب کو انسانی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔ عراق عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہی (Origin) یعنی سرچشمہ ہے۔ یہیں سے دنیا کی دوسری تمام تہذیبوں نے ضیاء پائی ہے۔ بابل کے دانش کدوں سے یونانیوں نے کسب فیض حاصل کیا۔ اقوام عالم اپنی تہذیبوں کا رشتہ بابل کے گہوارے میں پرورش پانے والی تہذیب سے جوڑتی ہیں۔ ماہرین کے مطابق بابلیوں کی جنت دریائے دجلہ وفرات کی وادی میں واقع تھی۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ باغ عدن کا اصل مقام دجلہ وفرات کا سرچشمہ ہے۔ کوفہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مملکت نینوا کی قدیم ترین بستی ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کا مسکن رہا ہے۔ یہیں ان کی اولاد پلی بڑھی اور طوفان عظیم کے بعد قبائل کی صورت میں مختلف علاقوں میں بکھر گئی۔ ایک قدیم روایت کے مطابق نمرود بھی یہیں پیدا ہوا۔ ایک اور تحقیق کے مطابق کوفہ سے کچھ فاصلے پر جو کھنڈر واقع ہیں وہ حمورابی اور بخت نصر کے شہر بابل کے ہیں۔ کوفہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آبائی شہر ''ار'' سے بھی قدیم قرار دیا جاتا ہے اور حضرت ادریس اور حضرت خضر علیہ السلام بھی یہاں رہا کرتے تھے۔ کوفہ کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب توریت میں بھی آیا ہے مگر اس سے مراد نجف اشرف کا وہ علاقہ ہے جو صدیوں پہلے پشت کوفہ کہلاتا تھا۔ یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا روضہ اقدس ہے۔ بعض مؤرخین کے مطابق نجف کبھی دنیا کا بلند ترین پہاڑ تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے ایک نافرمان بیٹے نے طوفان عظیم کے دوران اس پہاڑ سے پناہ مانگی تھی۔ تب یہ حکم خداوندی سے ریزہ ریزہ ہو کر نرم ریت کی صورت اختیار کر گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر حضرت آدم علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے رہائی ملی۔

لاتعداد انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اہل بیت رضی اللہ عنہم اور اولیائے عظام رحمۃ اللہ علیہم کا یہ مسکن اپنی تاریخ کے اعتبار سے اتنا قدیم ہے کہ ماضی بعید کے

جھروکوں سے بھی اس پر پڑنے والی روشنی بھی دھندلائی ہوئی ہے۔ تاہم اس سرزمین کے بارے میں ماہرین جو بات وثوق سے کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ خطہ شروع ہی سے تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے اور یہ کہ اس خطے نے اپنے عروج وزوال کے اتنے مراحل طے کئے ہیں کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی تاریخ کے ہر ورق پر عروج و زوال کی داستانیں مرقوم نظر آتی ہیں۔ یہ سرزمین دنیا کے ان چند قدیم خطوں میں شمار ہوتی ہے جہاں انسان ہمیشہ آباد رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں کی مٹی نے حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں ہی بنی نوع انسان کے قدم چوم لئے تھے۔ تاہم تحریری تاریخ کے حوالے سے یہاں چھ ہزار سال قبل مسیح تک آبادی کا سراغ ملتا ہے۔

عراق کی سرزمین الف لیلوی داستانوں کا مرکز ہے۔ سامری جادوگر کے قصے، چراغ الہ دین کے طلسمات، طلسم ہوشربا سے متعلق واقعات، علی بابا چالیس چور کی کہانی اور سندباد جہازی کا تعلق اسی خطہ زمین سے ہے۔ دنیا کے سات عجوبوں میں سے ایک عجوبہ عالم بابل کے معلق باغات بھی اسی سرزمین پر ثابت ہیں۔ ہاروت و ماروت کا واقعہ یہیں ہوا۔ نامور مسلمان سائنسدان ''ابومحمد ابن الہیثم'' بھی یہیں پیدا ہوا۔ صلیبی جنگوں کے فاتح سلطان صلاح الدین ایوبی کا وطن بھی یہی ہے۔

سرزمین عراق کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ دنیا کا پہلا پہیہ یہیں ایجاد ہوا۔ علم نجوم اور علم ریاضی کی ابتداء بھی اسی سرزمین سے ہوئی۔ تصویری رسم الخط کا اجراء تحریری قوانین اور جمہوری نظام حکومت بھی سب سے پہلے یہیں مروج ہوا۔ قلعہ شکن کلیں بھی پہلی بار یہیں تیار ہوئیں۔ دنیا کی پہلی یونیورسٹی بھی یہاں قائم ہوئی۔ پہلی بار تانبے کا برتن بھی یہیں استعمال میں آیا۔ انجینئرنگ کا پہلا ڈھانچہ (سٹرکچر) اور ڈیزائن بھی یہیں ترتیب دیا گیا۔ زراعتی جنتری جس کے ذریعے کسان فصلوں کے لئے موزوں موسم اور ان کی کٹائی کے لئے مناسب وقت کا تعین کر سکے یہیں ترتیب پائی۔ تہذیب کے دو اہم ستون بنی نوع انسان نے یہاں قائم کئے۔ پہلا یہ کہ تحریر (لکھائی) ایجاد کی اور دوسرا زراعت سیکھی۔ بارہویں صدی میں بغداد میں ڈاک

رسانی کے لئے کبوتروں کے استعمال کا نظام رائج کیا گیا۔ اس مقصد کے لئے ہالینڈ سے کبوتر عراق منگوائے گئے تھے انہیں بغدادی کبوتر کہا جاتا تھا۔

عراق کی سرزمین آرمینیا کے سطح مرتفع کے جنوبی ڈھلوانوں سے خلیج فارس تک تقریباً 6 سو میل کی لمبائی میں پھیلی ہوئی ہے۔ عراق کی تاریخ کا آغاز غیر ملکی حملہ آوروں سے ہوتا ہے۔ جو 3200 اور 3500 ق م کے درمیان دریائے فرات اور شط العسی کے سنگم پر واقع شبرار (ار) میں آ کر آباد ہوئے۔ زمانہ قدیم میں اشور (Assyria) اور جنوبی سمت میں بابل دونوں حصوں میں بڑے بڑے شہر آباد تھے۔ اشور کے شہروں میں نینوا، فورس آباد اور اربیلا قابل ذکر ہیں۔ اربیلا کو آج کل اربیل کہتے ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے قدیم شہر مانا جاتا ہے۔ بابل کے شہروں میں خود بابل، کش، اکادر، ار قابل ذکر ہیں۔ عام روایت کے مطابق ''ار'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وطن تھا۔ آخری شہر بابل کے جنوبی علاقے میں واقع تھا اور اسے زمانہ قدیم میں سیر کہتے تھے۔ اشور کے شہر دریائے دجلہ کے کنارے واقع تھے اور بابل کے شہر دریائے فرات یا اس کے قریب آباد تھے۔

بابل کے ابتدائی باشندوں کی نسل کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے کوئی چار ہزار سال قبل جنوبی حصے میں سمیری آباد تھے اور شمالی حصے میں اکادی جنہیں عام طور پر سامی سمجھا جاتا ہے۔ تیسرے ہزار سال میں شمالی شام سے اموری بابل پہنچ گئے اور اس حکمران خاندان کی بنیاد پڑی جس کا مشہور ترین فرد حمورابی تھا۔ ایک زمانے میں شمال مشرق کی طرف سے غیر مہذب پہاڑی باشندوں نے اس ملک پر حملہ کیا اور پھر کسّی وہاں قابض ہو گئے۔ 1100 ق م کے لگ بھگ ارامیوں نے ملک کو پامال کر ڈالا اور دریائے فرات کے ساتھ ساتھ پورے علاقے پر قابض ہو گئے۔ یہ بھی سامی تھے۔ انہی میں سے ایک قبیلہ کلدانیوں کا بھی تھا جس نے بابل میں حکمرانی مسند آراستہ کر لی۔ بخت نصر اسی خاندان کا مشہور بادشاہ تھا۔

سمیریوں کی حکومت شہری ریاستوں میں بٹی ہوئی تھی اور ان کے درمیان حدود یا آبیاری

کے حقوق کے متعلق مسلسل کشمکش جاری رہتی تھی۔ بعض شہری ریاستیں پورے ملک کو زیرتسلط رکھنے کے لئے بھی لڑائیاں کرتی رہتی تھیں۔ لڑائیوں نے انہیں فنون جنگ میں بالکل طاق بنا دیا تھا اور سازوسامان جنگ کے لحاظ سے انہیں اپنے ہم عصر مصریوں پر فوقیت حاصل تھی۔ چنانچہ وہ لوگ مصریوں سے ایک ہزار سال پیشتر جنگی رتھ استعمال کرنے لگے تھے۔ دورافتادہ ملکوں کے ساتھ تجارت بھی خوب تھی۔ انہوں نے جابجا تجارتی مراکز قائم کر لئے تھے اور ان کے ذریعے سے کرنسی کا کاروبار بھی ہوتا تھا۔ ناپ تول کے پیمانے مقرر تھے اور عہدنامے باقاعدہ لکھے جاتے تھے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے سب سے پہلے شہری قوانین کا مجموعہ تیار کیا۔ بعض اوقات اشیاء کی قیمتیں اور کارکنوں کی اجرتیں قانون کے ذریعے مقرر کر دی جاتی تھیں۔ ان کا شش گانہ عددی نظام تھا جس کے ساتھ بہت جلد دہ گانہ نظام شامل کر دیا گیا تھا۔ مثلاً دن کے چوبیس گھنٹے اور گھنٹے کے ساٹھ منٹ، منٹ کے ساٹھ سیکنڈ۔ ابتداء میں تصویری رسم الخط رواج پا گیا تھا۔ انہوں نے بیکانی رسم الخط ایجاد کیا جو مٹی کی تختیوں پر کندہ کرنے کے لئے بہت موزوں تھا۔

ابتداء میں ہر شہر کا معبود الگ تھا پھر تمام دیویوں اور دیوتاؤں کو جمع کر دیا گیا اور ان میں سے تین کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔ اول آسمان کا دیوتا، دوم زمین اور فضا کا دیوتا، سوم پانی کا دیوتا۔

انلیل جسے آسمان کا دیوتا کہتے تھے سب سے بڑا مانا جاتا تھا۔ یہاں عبادت کی غرض سے مندر تعمیر کر لئے تھے ان کی وضع قطع ایک بے قاعدہ سہ پایہ حرم کی سی ہوتی تھی اس پر چھوٹی سی عمارت تعمیر کر لی جاتی تھی۔ ان کے درمیان بعض عجیب وغریب افسانے مشہور تھے مثلاً دنیا کی تخلیق کیوں کر ہوئی، پھر طوفان کیسے آیا اور حیات ابدی کی تلاش کس وجہ سے بے نتیجہ رہی وغیرہ وغیرہ؟

شاہی حکومت کا آغاز پہلے پہل ''اُر'' میں ہوا۔ یہ خاندان 2450ق م سے 2850ق م تک حکمران رہا۔ پھر اکادی سلطنت کا دور آ گیا جس کے دو بادشاہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

ایک سرغون، دوسرا اس کا بیٹا نرام سن۔ یہ لوگ اکاد، سمیر، عیلام، اشور اور شمالی شام پر حکومت کرتے رہے۔ اکادیوں نے سمیری تہذیب و ثقافت بھی اپنا لی تھی۔ سرغون نے کلدانیہ میں ایک نہایت عالی شان کتب خانہ بھی قائم کیا تھا جس کی کتابوں کے لئے کاغذ کی بجائے اینٹیں استعمال کی گئی تھیں۔

2270 ق م میں وحشی قبیلوں کے حملے شروع ہو گئے۔ انہوں نے بابل کو فتح کر لیا اور ایک سو پچیس سال اس پر حکمران رہے۔ ''اُر'' میں شاہی خاندان کی حکومت ایک سے زیادہ مرتبہ قائم ہوئی۔ وہاں کا تیسرا شاہی خاندان 2030 ق م سے 2140 ق م تک حکمران رہا جس کی سلطنت اشور وار بیلا سے خلیج فارس تک اور سوس سے لبنان تک پھیلی ہوئی تھی۔

دنیا کے سب سے بڑے شہر بابل کی تہذیب و ثقافت کو کئی وجوہات سے شہرملی۔ اہلِ بابل نے سمیریوں کی تہذیب کو درجہ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ ان کی تجارت کے سلسلے دُور دُور تک پھیل گئے۔ ان کا نظام حکومت بہت اعلیٰ تھا، پھر انہوں نے عالی شان عمارتیں بنائیں، فنون لطیفہ میں بلند درجہ حاصل کیا۔ یہ کہ حمورابی نے قوانین کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا جو زمانہ قدیم کا نہایت قیمتی سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔

جب بابل ایک سلطنت کا مرکز اور دنیا کا بہت بڑا شہر بن گیا تو اس کے دیوتا مردوزخ نے خاص اہمیت حاصل کر لی، اسے وہی درجہ مل گیا جو سمیریوں نے آسمانی دیوتا کے لئے تجویز کیا تھا۔ آگے چل کر اسے بعل کہنے لگے۔ بابلیوں نے جادو، ٹونے، ٹوٹکے اور سحر کے فن کو بھی بہت ترقی دے دی تھی۔ وہ اجرام سماوی کی نقل و حرکت سے خاص اثرات و نتائج اخذ کرتے تھے۔

بابل میں پہلی عبور حکومت تقریباً 1900 ق م میں قائم ہوئی اور کم و بیش تین سو سال رہی۔ اس حکمران خاندان کا چھٹا بادشاہ حمورابی تھا۔ اس کا شمار عہد قدیم کے چند بڑے بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ اس کا زمانہ 1800 ق م کے قریب تھا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔ اس نے پورے عراق کو فتح کیا اور رفاہ عامہ کے

لئے وسیع پیمانے پر تدابیر اختیار کیں۔ اس نے جو قوانین بنائے رومی سلطنت کے زمانے تک ان کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کی وفات کے بعد اس خاندان کی حکومت کمزور ہوگئی پھر عراق کے ساحلی علاقے میں ایک نئی حکومت وجود میں آئی۔

1600 ق م کے آس پاس ہٹیوں نے بابل پر یورش کی۔ پھر کھّیوں نے اس کو فتح کر لیا اور ساڑھے چار سو سال تک حکمران رہے۔ 1146 ق م میں ایک نیا خاندان برسر اقتدار آ گیا۔ اس زمانے میں عیلامیوں اور آرامیوں کے حملے ہوئے۔ 900 ق م میں اشوریوں کے ساتھ تباہ کن لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ 729 ق م میں اشوریوں نے بادشاہ تھلت پلسر سوم نے بابل پر قبضہ جما لیا اور اس وقت سے 625 ق م تک بابل، اشوری سلطنت کا حصہ بنا رہا۔

625 ق م میں بابل نے از سر نو آزادی حاصل کی اور وہاں کلدانیوں کی سلطنت قائم ہوئی جس کا بانی نیوپلاسر تھا۔ اس نے مادہ کے بادشاہ سے مل کر 612 ق م میں اشوری سلطنت کو تباہ کر دیا اور اس کے علاقے دونوں حلیفوں میں تقسیم ہو گئے۔ اس بابلی خاندان کا مشہور بادشاہ بخت نصر تھا جو 521 ق م میں تخت نشین ہوا۔ بخت نصر نے مصریوں کو شکست دی۔ یہودیہ کو بابل سلطنت کا جزو بنایا۔ وہ یہودیوں کو گرفتار کر کے بابل لے آیا۔ اس لئے کہ وہ بار بار بغاوتیں کرتے تھے۔ اس نے بابل کے اردگرد وہ عالی شان فصیلیں بنوائیں اور عمارتیں تعمیر کروائیں جس کی تعریف یونانی مؤرخین نے کئی موقعوں پر کی ہے۔

538 ق م میں سائرس شہنشاہ ایران نے بابل کو فتح کر لیا اور کافی عرصہ یہ شہر ایرانیوں ہی کے قبضے میں رہا۔ پھر سکندر نے اسے اپنی سلطنت کا مرکز بنا لیا۔ سکندر کی ایشیائی میراث سلوکیوں کے قبضہ میں آئی۔ 171 ق م سے 226ء تک پارتھی وہاں کے حکمران رہے۔ بعد ازاں ایران کے ساسانی بادشاہ اس پر قابض ہو گئے۔ 641 میں عرب مسلمان بابل کے مالک ومختار بن گئے۔

نینوا میں اشوری سلطنت قائم ہوئی جس کے بادشاہ اشور بنی پال نے اپنے کتب خانے میں عہد قدیم کی تمام تحریروں کو جمع کرنے کی ہر ممکن کوششیں کیں۔ اشوریوں کی تہذیب میں

بابلیوں کے اثرات بھی موجود ہیں اور ہٹیوں کے اثرات بھی پائے جاتے تھے۔ وہ قومی دیوتا کی پوجا کرتے تھے جس کا نام اشور تھا۔ بعد میں اشتر کی پوجا بھی شروع کر دی۔ انیسویں صدی قبل مسیح میں کچھ عرصہ تک اشوریہ بابل کے ماتحت رہا۔ اشوریہ کی عظمت کا پہلا دور 933 ق م میں شروع ہوا۔ اس دور کے دو بڑے بادشاہ ہیں۔ ایک اشور نصر پال ثانی جس نے بحیرۂ روم تک کے علاقے فتح کر لئے اور ملکی انتظام بہت اعلیٰ پیمانے پر پہنچا دیا۔ اسی کے عہد میں قلعے توڑنے والے آلہ جات اور محاصروں میں کام دینے والی منجنیقیں استعمال ہونے لگیں۔ دوسرا بادشاہ شلمنسر ہے۔ اس نے صور، صیدا اور اسرائیل سے خراج لیا۔ قدیم زمانے کی مشہور ملکہ سیمی رامیس (806 ق م، 810 ق م) کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔ 745 ق م میں اشوریوں کی عظمت کا نیا دور شروع ہوا۔ اس دور کے متعدد بادشاہوں نے شہرت پائی۔ مثلاً تھلت پلسر سوم، مرغون دوم، سخیرب اور اشور بنی پال، آخرالذکر بادشاہ نے عربوں، عیلامیوں اور کلدانیوں کے خلاف کامیاب لڑائیاں جاری رکھیں۔ 625 ق م میں سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔

539 ق م میں بابل کے آخری بادشاہ کوفرس کو بادشاہ سائرس نے شکست دی اور سائرس فتح مند ہو کر بابل میں داخل ہوا۔ عراق پر فارس کی حکومت 331 تا 539 ق م قائم رہی۔ اس کے بعد اسکندر مقدونی اور اس کے جانشین جرنیل حکمران رہے۔ 141 ق م سے 226 بعد از قبل مسیح تک اس پر پارتھیا کی حکومت رہی۔ 226ء سے 637ء تک اس پر ساسانی بادشاہوں کا غلبہ رہا۔

مسلمانوں نے عراق پر پہلا حملہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کی زیر قیادت 633 عیسوی میں کیا۔ جس کے بعد آئندہ 5 برسوں میں وہ تمام عراق پر چھا گئے۔ 750ء کے قریب اس پر بنی عباس کی حکومت قائم ہوئی۔ اس کا دورِ اقتدار 1258ء تک قائم رہا۔ اس دوران بغداد کئی بار اُجڑا اور یہاں کئی قیامتیں برپا ہوئیں۔ بنی عباس کے بعد اس کی حکومت یکے بعد دیگرے منگولوں، ترکمانوں اور صفاری

حکمرانوں کے ہاتھ میں رہی۔ جن کا مجموعی دور اقتدار 1258ء سے 1534ء تک ہے کیوں کہ 1258ء میں ہلاکو خاں نے 2 لاکھ فوجیوں کے ساتھ عراق کو تہس نہس کر دیا اور 40 دن تک لوٹ مار اور قتل و غارت کی جس سے بغداد کی گلیاں اور بازار خون سے بھر گئے۔ حملہ آوروں نے بغداد کے تمام کتب خانے تباہ کر دیئے یا جلا دیئے تھے۔ اس کے اختتام پر عراق عثمانی ترکوں کی عملداری میں آ گیا اور 1918ء تک ان کے زیر تسلط رہا۔ پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ نے عراق پر قبضہ کر لیا۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر 1920ء میں عراق کو برطانیہ کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ 1921ء میں انگریزوں نے شاہ فیصل اول کو عراق کا بادشاہ بنا دیا۔ 1924ء میں ملک میں نیا آئین نافذ ہوا جس کی رو سے طے پایا کہ بادشاہ کے اختیارات محدود ہوں گے اور وہ پارلیمانی نظام حکومت چلائے گا۔ شاہ فیصل اول جو سابق شاہ حجاز شریف حسین مکہ کا بیٹا اور شاہ اردن عبداللہ کا سوتیلا بھائی تھا۔ 1932ء میں شاہ نے عراق کی مکمل آزادی کا اعلان کیا۔ 8 ستمبر 1933ء میں ان کا انتقال ہو گیا اور ان کا بیٹا غازی تخت نشین ہو گیا۔ جس نے 1933ء سے 1939ء تک حکومت کی۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے شاہ فیصل دوم کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ وہ اس وقت چونکہ کم سن تھا اس لئے اس کا چچا امیر عبداللہ امیر مقرر ہوا۔ امیر فیصل دوم کی رسم تاج پوشی 1953ء میں ہوئی اور امیر عبداللہ کو ولی عہد بنایا گیا۔ جولائی 1958ء میں جنرل عبدالکریم قاسم نے امیر فیصل کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا اور ملک کا نظام حکومت ایک انقلابی کونسل کے سپرد کر دیا۔ عراق کو جمہوریہ قرار دے دیا گیا جس کے صدر لیفٹیننٹ جنرل نجیب الربیع اور وزیراعظم جنرل عبدالکریم قاسم مقرر ہوئے۔

فروری 1963ء میں دوبارہ فوجی بغاوت ہوئی جس میں عبدالسلام محمد عارف صدر اور احمد حسن وزیراعظم بن گئے۔ سابق صدر صدام حسین کا نام بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر گذشتہ چار دہائیوں سے عراقی سیاست پر چھایا ہوا ہے۔ صدام حسین اپریل 1937ء میں پیدا ہوئے۔ کالج کے زمانے میں انہوں نے 1956ء میں بعث پارٹی میں شمولیت کی۔ دو سال

بعد جب حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا تو اس وقت وزیراعظم عبدالکریم قاسم کو قتل کرنے کی سازش میں وہ بھی شریک تھے۔ صدام حسین ملک سے فرار ہو گئے تاہم 1963ء میں واپس آ گئے۔ اس وقت بعث پارٹی نے بغداد پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا لیکن چند ماہ میں یہ پارٹی اقتدار سے محروم ہو گئی۔ صدام حسین کو قید کر لیا گیا۔ 1968ء میں پارٹی نے بغاوت کے بعد دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا۔ صدام حسین نے انقلابی کمان کونسل میں اہم جگہ حاصل کر لی۔ کئی برسوں تک وہ صدر احمد حسن البکر کے پس پردہ اہم کردار ادا کرتے رہے اور 1979ء میں صدام حسین نے مکمل طور پر عراق کے صدر کا عہدہ سنبھال لیا اور بلاشرکت غیرے 2003ء میں امریکی قبضہ مکمل ہونے تک صدر رہے اور آج کل قید میں ہیں جہاں انہیں اپنے خلاف مقدمات کی مزید کارروائی کا انتظار ہے۔ خطہ عراق اور اہل عراق ابھی بھی تباہی و امن کے دوراہے پر کھڑے ہیں۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ آنے والے دنوں میں ان کے مقدر میں کیا لکھا ہے۔

سفر وسیلہ ظفر

شوق اور جنون نے مجھے سیاحت پر آمادہ تو کر لیا تھا مگر جونہی طویل سفر کی مشکلات کے بارے میں سوچا تو سر تھام کر بیٹھ گیا۔ لاہور ریلوے اسٹیشن سے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے کہ نہ جانے کب یہ ٹرین کوئٹہ پہنچے گی اور سفر خیریت سے گزرے گا یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس پریشانی کا ایک سبب تو ہمسفروں سے پیشگی جان پہچان نہ ہونا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے کبھی خوشی سے ٹرین میں مختصر سفر نہیں کیا کجا یہ سینکڑوں میل کا سفر درپیش تھا۔

ریل میں سفر کو ناپسند کرنے کی وجہ یہ ٹھہری کہ اس میں ٹکٹ خریدنے کے باوجود امید نہیں ہوتی کہ آپ سیٹ پر بیٹھ کر سفر کریں گے۔ پھر سینما ہال کی طرح اچھے ہمسفر کم ہی ملتے ہیں۔ 5 افراد کی سیٹ پر 3 بیٹھے ہوتے ہیں کہ گویا اب کوئی دوسرا مسافر وہاں نہیں بیٹھ سکتا۔ ٹرین مقررہ وقت سے چاہے جتنی مرضی لیٹ ہو جائے آپ خود کو کوسنے کے سوا کسی سے شکایت بھی نہیں کر سکتے۔ بہرحال یہ سفر اس لحاظ سے صبر کا امتحان ٹھہرا..... کیونکہ گھر سے کوئٹہ کے راستے ایران اور پھر عراق کے طویل ترین سفر کا ارادہ باندھ کر نکلا تھا۔

چلتن ایکسپریس نامی اس گاڑی کے ملتان پہنچنے تک رات کا اندھیرا چھا گیا اور ملتان پہنچنے تک شاید ہی کوئی بدقسمت اسٹیشن ہو جہاں ''چلتن ایکسپریس'' نے قیام نہ کیا ہو۔ مجھے اس دوران ایک برتھ پر لیٹنے کا اتفاق ہوا تو وہاں کسی دل جلے نے لکھ دیا تھا ''چلتن پر بیٹھنے سے بہتر ہے کہ آپ کسی گدھا گاڑی پر بیٹھ جائیں''۔ ٹرین چلتی رہے تو کوئی اس قسم کی شکایت نہ کرے مگر جگہ جگہ رک کر وقت ضائع کرے تو کون کافر اسے دعائیں دے گا؟ یہاں کوئی آدھ گھنٹہ سے زائد وقت قیام کے بعد ٹرین اندھیرے میں چل پڑی اور رات بھر سفر جاری

رہا۔ اگلی صبح کی پو پھوٹی تو ٹرین سندھ کے علاقہ میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ علاقہ میرے لئے نیا تھا۔ ریلوے لائن کے اردگرد سیم وتھور زدہ علاقہ میں پانی کھڑا تھا اور ٹرین کی رفتار قدرے آہستہ تھی جس کی وجہ سے اس علاقہ کا دُور تک نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پٹڑی کے ساتھ ساتھ کھڑے پانی میں دُور تک کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہ تعداد میں اتنے زیادہ تھے کہ میلوں تک بہار دکھا رہے تھے۔ اردگرد دُور جھونپڑی نما گھروں میں لوگ بیدار ہو چکے تھے اور جیسے جیسے سورج کی روشنی پھیلتی گئی دھان کی فصل سے مویشیوں کے لئے جڑی بوٹیاں اکھاڑ کر چارہ جمع کرنے والوں کی تعداد بڑھتی نظر آئی۔ حیران کن امر یہ تھا کہ یہ زیادہ تر خواتین اور نوجوان لڑکیاں تھیں، مرد خال خال ہی نظر آئے۔ لڑکیوں نے سندھی کشیدہ کاری والے لباس پہن رکھے تھے اور ننگے پاؤں دھان کے کھیتوں میں اپنی کمر پر ڈالی کپڑے کی جھولی میں چارہ جمع کرنے میں مصروف تھیں۔ پٹڑی کے پاس کھڑے اور سکول جاتے بچے ٹرین کو دیکھ کر خوش ہوتے اور زور زور سے ہاتھ ہلاتے تھے۔ کندھ کوٹ اسٹیشن سے پہلیاور بعد میں متعدد ریلوے اسٹیشنز کی عمارات خستہ حال نظر آئیں اور ان پر ٹرین رکی بھی نہیں۔

کندھ کوٹ کے بعد خدا خدا کر کے جیکب آباد آیا اس وقت سب کا بھوک سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ وہاں جو دستیاب تھا سب نے ٹرین کے 20 منٹ سٹاپ کے دوران کھایا۔ جیکب آباد سے چلتن ایکسپریس روانہ ہوئی تو احساس ہوا کہ یہ واقعی پاکستان کا گرم ترین مقام ہے۔ کیوں کہ کھڑی گاڑی کی نسبت چلتی گاڑی میں ہوا زیادہ شدت سے جسموں کو چھوتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین بلوچستان میں داخل ہوگئی۔ بلوچستان کیا تھا، اِکا دُکا آبادی تھی ورنہ ہر طرف تا حدِ نظر بیابان۔ سبی سے پہلے ایک دو اسٹیشنز پر ٹرین رکی۔ وہاں بھی تمام گھر مٹی کے بنائے ہوئے تھے مگر ان میں بجلی مہیا کی گئی تھی اور دُور دراز سے کھمبے ان تک بجلی کی سہولت پہنچا رہے تھے۔ پانی کی کمی شدت سے تھی حتیٰ کہ ہم سب لوگ حقیقتاً پیاسے تھے۔ میں نے پیاس بجھانے کے لئے ٹرین میں بیچنے والے سے مرنڈا کی بوتل خریدی مگر وہ شاید معیاری نہیں تھی اس لئے مختصر وقت کے لئے گلا تر ہوا، اس کے بعد پیاس مزید بڑھ گئی۔ بلوچستان کا

بیابان علاقہ تھا کہ ختم ہونے کو نہیں آ رہا تھا اور ہم میں سے ہر ایک سبی شہر کے آنے کا منتظر تھا۔ جیسے ہی دوپہر کے وقت ٹرین سبی سٹیشن پر رکی ہر ایک پانی پینے اور کھانا کھانے کے لئے دوڑ پڑا۔ سبی کا پانی ''تیلیا'' سا تھا اور اسٹیشن پر نصب ایک الیکٹرک کولر سے ٹھنڈا پانی سب نے جی بھر کر پیا۔ آدھ گھنٹہ کے وقفہ میں ٹرین کو ایک اور انجن لگا دیا گیا یعنی آگے پیچھے انجن تھے اور وہ بھی ڈیزل سے چلنے والے۔ میں نے گیٹ میں ساتھ کھڑے بشیر کیانی سے اس طویل سفر میں اپنی تھکاوٹ کے ساتھ بوریت کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا ''سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے'' اور سفر کو انجوائے کرنا چاہئے۔ اب تو آگے کوئٹہ کا سفر تھوڑا رہ گیا ہے مگر پہاڑوں پر چڑھائی کی وجہ سے وقت زیادہ لگے گا باوجود اس کے کہ دو انجن لگے ہوئے ہیں۔ یوں اس نے ایک طرح سے میری ڈھارس بندھائی۔

ٹرین واقعی سبی سے کوئٹہ کے لئے سفر سے نہ صرف بلندی پر جانے بلکہ پُرخطر ہونے کی وجہ سے بڑی محتاط رفتار سے کر رہی تھی۔ مگر پہاڑوں کے درمیان بلندی پر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا گرم علاقوں کے بعد خاصا لطف دے رہی تھی۔ اس دوران ٹرین یکے بعد دیگرے کئی سرنگوں سے گزری۔ راستہ میں ''آب گم'' نامی اسٹیشن پر دو ''چلتنیں'' اتفاق سے اکٹھی ہو گئیں، دوسری کوئٹہ سے آ رہی تھی۔ وہاں پانی تو دستیاب نہیں تھا مگر گرما اور کھیرے بہت سستے مل رہے تھے۔ ہم نے ان سے دوہرا کام لیا کھایا بھی اور پیاس بھی بجھائی۔ اس سے آگے ''مچھ'' بلند ترین مقام ہے اور سبی سے ٹرین کے ساتھ لگنے والا دوسرا انجن یہاں علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ کیوں کہ اب کوئٹہ کی سمت پہاڑوں سے اترائی تھی۔ یہ راستہ پُرخطر تھا لیکن ناقابل یقین حد تک کاریگری سے ریلوے ٹریک بنایا گیا تھا۔ بڑی عمر کے اصحاب بتا رہے تھے کہ یہ انگریزوں کا ہی کارنامہ ہے کہ انہوں نے ریلوے لائن کو یہاں سے گزار دیا۔ گاڑی کو سبی سے کوئٹہ تک 20 سرنگوں سے گزرنا پڑتا ہے اور ہر سرنگ سے گزرنے کے دوران میں انجن کا دھواں اپنے اپنے حصہ کے مطابق مسافروں کے کپڑوں اور منہ تک بھی پہنچتا ہے۔

دیوہیکل پہاڑوں کے درمیان پر پیچ ریلوے ٹریک پر ٹرین کی رفتار خاصی کم تھی۔ بعض

مقامات پر ٹرین کو دیکھ کر وہاں اردگرد گھروں یا خیموں سے 5 سے 12 سال کی عمر کے بچے اور بچیاں بھاگ کر ریلوے لائن کے ساتھ فاصلے پر کھڑے ہو جاتے اور ٹرین قریب آنے پر دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بنا کر اور اپنی طرف کچھ پھینکنے کا اشارہ بھی کرتے۔ میں پہلے تو یہ سمجھا کہ شاید ٹرین کو دیکھنے کے لئے قریب آنے کی ''بچگانہ'' حرکت کرتے ہیں۔ مگر غور کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کے اس عمل کے جواب میں ٹرین سے کوئی چیز بھی پھینکی جا رہی ہے۔ پتہ چلا کہ وہ اس طریقے سے مانگتے ہیں اور مسافران کی معصومیت اور حرکتوں سے محظوظ ہو کر روپے نیچے گرا دیتے ہیں جنہیں پکڑنے کے لئے وہ جیسے ہی ٹرین گزر جاتی ہے دوڑ کر لائن پر آ جاتے ہیں۔ میں نے بھی تجربہ کیا تو واقعی ایسا تھا۔ یہ بچے اس طرح مانگنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ کہیں دو چار اکٹھے ہوتے ہیں تو کسی جگہ ایک بچہ بھی کھڑا اسی قسم کے اشارے کر رہا ہوتا ہے۔

لاہور سے روانہ ہوئے ہمیں 24 گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے اور کوئٹہ ابھی دُور تھا۔ سورج پھر غروب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خدا خدا کر کے وادی چلتن کوئٹہ کے آثار نظر آئے مگر ٹرین کے اسٹیشن پر رکنے اور ہمارے اُترنے تک شام کے سات بج چکے تھے۔ یوں میں نے اپنی زندگی کا پہلا طویل ترین سفر طے کیا جو مسلسل 32 گھنٹے پر مشتمل تھا۔ اسٹیشن سے تھوڑے فاصلہ پر ہوٹل میں ہمارے قیام کا بندوبست تھا۔ وہاں ''ٹور'' کے منتظم انجم صاحب نے چار افراد کے لئے مخصوص کمرہ میں مجھے لے جا کر وہاں دیگر حضرات سے تعارف کروایا۔ لاہور کے راشد سے جان پہچان نکل آئی کیوں کہ ان کے اور ہمارے دوست مشترکہ تھے۔ ہماری ملاقات پہلی تھی جو حسن اتفاق تھی۔ کمرہ میں بشیر اعوان اور عارف سعید سے بھی گپ شپ اور پھر بے تکلفی ہوگئی۔ رات کا کھانا ہم نے بازار جا کر کھایا۔ واپسی پر کچھ ساتھیوں نے بتایا کہ انہوں نے اسی ہوٹل سے کھانا کھایا مگر انہوں نے بل وصول کر کے ان کی کھال اتار لی۔ تھکاوٹ کی وجہ سے دیر تک سوئے رہے۔

صبح جمعہ تھا اور ہمیں ''تفتان'' (ایران کی سرحد پر واقع مقام) کے لئے سہ پہر روانہ ہونا تھا۔ تیاری کے بعد نماز جمعہ ادا کی اور کھانا کھانے کے بعد کرنسی تبدیل کروانے کے لئے بازار

گئے۔ وہاں کرنسی تبادلہ کا ریٹ ایک روپیہ پاکستانی کے بدلے ساڑھے بارہ سو ریال ایرانی تھا۔تقریباً 5 بجے ہمیں ''تفتان'' تک لے جانے کے لئے بسیں آ گئیں اور شام سے پہلے سفر شروع ہو گیا۔ ہم سابقہ ''آر سی ڈی'' حالیہ ''ای سی او'' شاہراہ پر محوِ سفر تھے۔ اِردگرد بڑے بڑے خشک پہاڑ تھے اور ہر طرف رات کا اندھیرا، جیسے جیسے رات بڑھ رہی تھی صحرا میں موسم خوشگوار ہوتا جا رہا تھا۔ اس شاہراہ پر نوکنڈی، نوشکی وغیرہ کی آبادیاں واقع ہیں اور ملیشیا کے جوان گاڑیاں روک کر انہیں ''چیک'' کرتے ہیں۔ سڑک کے اطراف میں اکثر جگہوں پر دُور دُور تک ریت نظر آتی ہے جس کی وجہ سے گاڑیوں کی کراسنگ میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ رات کو ریت کے طوفان اکثر چلتے ہیں۔ جن سے سڑک پر ٹیلے بن جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس شاہراہ پر ماہر ڈرائیور ہی گاڑی چلا سکتے ہیں ورنہ حادثہ یقینی بات ہے۔ کوئٹہ سے تفتان کے لئے ریل گاڑی بھی ہفتہ میں دو دن چلتی ہے مگر پہلے سننے میں آیا اور پھر سفر سے اندازہ ہوا کہ ریل کے سفر میں تو بہت بُرا حال ہوتا ہے کیوں کہ ایک تو کم رفتار سے چلنا ریل کی مجبوری ہوتی ہے دوسرا پورے علاقہ کی ریت مسافروں پر ہی پڑتی ہے۔ تفتان پہنچنے تک وہ ناقابل شناخت ہو جاتے ہوں گے۔ اس شاہراہ پر ایک آدھ جگہ ہوٹل بھی ہیں اور پٹرول پمپ بھی مگر خاصے دُور۔ بالآخر 12 گھنٹے سے زائد مسلسل سفر کے بعد ہم پاک ایران سرحد پر واقع تفتان پہنچ گئے۔ اس وقت صبح کے 7 بجے تھے اور بارڈر 9 بجے کھلنا تھا۔ یہاں پر واجبی سے ہوٹل بنے تھے جہاں چائے وغیرہ دستیاب تھی مگر پانی کی شدید قلت تھی۔ چھوٹی چھوٹی کھوکھا نما دکانوں پر بڑی تعداد میں ایرانی سامان، کمبل، کولر، صابن وغیرہ پڑا تھا۔ 9 بجے تو ہم اپنا سامان لے کر پاکستان کے امیگریشن آفس کے باہر پہنچ گئے۔ دھوپ بہت تیز تھی مگر وہاں سایہ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ایک بڑے سے دفتر میں آنے اور جانے والے مسافروں کے پاسپورٹس پر مہریں لگائی جا رہی تھیں۔ دو گھنٹہ تک ہمیں وہاں رکنا پڑا مگر اس دوران کہیں سے بھی پینے کے لئے پانی نہ مل سکا اور مجبوراً دھوپ میں کھڑے اور بیٹھے رہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی تفتیشی سیل میں ہیں۔ حتیٰ کہ رفع حاجت کا کوئی انتظام نہیں تھا جس کی وجہ سے خواتین اور

بچے مارے مارے پھرتے تھے۔ ہمارے پاسپورٹ زیادہ تھے جن پر Exit کی مہریں لگ کر آئیں تو پاسپورٹ ہاتھ میں لے کر ہم ایران کی حدود میں داخل ہو گئے۔ ایک بڑے ہال میں ہمارے سامان کی سرسری چیکنگ ہوئی اور امیگریشن کاؤنٹر پر فارم جمع کروانے کے بعد پاسپورٹ پر Entery کی مہر لگا دی گئی۔ ایران میں خواتین کے لئے الگ کاؤنٹر تھا جہاں ''خانم'' فارم لے کر مہریں لگا رہی تھی۔ آدھ گھنٹے میں ہم یہاں سے فارغ ہو گئے۔

اس دوران ایک نوجوان ایرانی سپاہی جو امیگریشن دفتر میں ڈیوٹی پر تھا سے سلام دعا ہوئی۔ اس نے پوچھا ''ایران خوب، پاکستان خوب''؟۔ میں نے کہا ''پاکستان خوب''۔ یہ سن کر اس نے پنسل جو وہ میری جیب سے نکال کر دیکھ رہا تھا جھٹ سے اپنی جیب میں لگا لی۔ میرے پاس فی الحال ایک ہی پنسل تھی جو اس نے قبضہ میں لے لی اور وہ مسکرانے لگا۔ میں نے فوراً ہی کہہ دیا ''ایران، پاکستان ہردو خوب است'' تب وہ خوش ہو گیا اور اس نے میری قیمتی پنسل واپس کر دی۔

منی بلوچستان

تفتان سے زاہدان کے لئے کوئی باقاعدہ ٹرانسپورٹ تو نہیں چلتی مگر وہاں ٹیوٹا لوڈر گاڑیاں چکر لگاتی رہتی ہیں جو پاکستان آنے والے مسافروں کو لاتی ہیں۔ امیگریشن سے فارغ ہونے کے بعد اس میں ہم بیٹھ گئے اور گاڑی جیسے ہی امیگریشن کی عمارت سے باہر نکلی پولیس پوسٹ پر رک کر ڈرائیور نے بتایا ''مسافر پاکستانی ہیں'' تو ہمارے پاسپورٹ چیک کئے گئے۔ چیکنگ کرنے والے تمام نوجوان سپاہی تھے جو لازمی عسکری تربیت حاصل کرنے کی غرض سے سرکاری ڈیوٹی کر رہے تھے۔ ایران میں ہر پندرہ سال کے نوجوان کو دو سال تک یہ ڈیوٹی انجام دینا پڑتی ہے۔ زاہدان کا فاصلہ 75 کلومیٹر تھا جو گاڑی نے 110، 120 کلومیٹر کی رفتار سے قریباً آدھ گھنٹے میں طے کیا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی اپنے ملک کے مقابلہ میں صفائی اور خوبصورتی کا احساس ہوا۔ تمام کے تمام کارخانے شہری حدود سے باہر واقع تھے۔ ایران میں تمام گاڑیاں ''لیفٹ ہینڈ ڈرائیو'' ہیں۔ زاہدان شہر کی خوبصورت سڑکوں سے گزرتی ہوئی گاڑی ٹرمینل (بس سٹینڈ) کے ساتھ واقع ''مسافر خانہ اسلامی'' نامی ہوٹل کے سامنے رکی جہاں ہم سب اُتر گئے۔ اسی طرح باقی حضرات بھی پہنچتے رہے۔ دوسری منزل پر ہمیں کمرہ ملا۔ راشد، بشیر اعوان اور عارف سعید اور میں ایک ہی کمرہ میں تھے۔ سامان وغیرہ رکھا اور مسلسل سفر کی وجہ سے ہر کسی کا نہانے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس ہوٹل کے نل میں پانی بڑے عجیب وغریب طریقے سے آتا تھا یعنی ٹونٹی میں پانی آ رہا ہے تو رک جائے گا اور پھر تین چار منٹ بعد آئے گا۔ اس صورت حال میں نہانے کے دوران عجیب تماشہ ہوتا، صابن لگا ہے اور پانی 5 منٹ تک غائب۔ ہر کوئی اس کی شکایت کر رہا تھا مگر ہوٹل والے کہتے کہ پانی آ تو رہا ہے۔ زاہدان کا پانی ٹھنڈا تھا مگر نہانے کے دوران سر کے بال اُلجھ جاتے تھے۔ خیر نہانے اور کپڑے

بدلنے کے بعد ابھی ہم نیچے جا کر کھانے پینے کی تیاری کر رہے تھے کہ ساتھ والے کمرہ سے ایک صاحب آئے اور پوچھنے لگے کہ کھانے پینے کا کیا پروگرام ہے؟ پھر مشورہ دیا کہ اکٹھے چلتے ہیں۔ ان کے کمرہ میں سے ایک اور صاحب بھی شامل ہوگئے۔ ایران میں بس سٹینڈ کو ''ٹرمینل'' اور ہر قسم کی گاڑی کو ''موٹر'' کہتے ہیں۔ ٹرمینل کے سامنے ایک ہوٹل میں چلے گئے وہاں بیٹھنے کے بعد بھی سوچ رہے تھے کہ کیا کھائیں۔ وہیں پہلے سے بیٹھے دو تین پاکستانی نوجوانوں میں سے ایک نے پوچھ لیا کہ آپ پاکستان سے ہیں؟ جواب پر اس نے سب سے سلام دعا اور خیریت پوچھنے کے بعد بتایا کہ وہ ماڈل ٹاؤن لاہور کا رہنے والا ہے اور دوستوں کے ہمراہ دو تین دن پہلے یہاں پہنچا ہے۔ پھر اس نے کھانے سے متعلق پہلے ہماری راہنمائی کی تب ہوٹل والے کو آرڈر دیا۔ اب وہ صاحب جو ہمارے کمرہ میں آئے تھے نے خود اور ان کے دوست نے ہم چاروں کی نسبت کھانے کے لئے زیادہ منگوایا۔ ہم نے چائے پی جو بغیر شیر (دودھ) کے تھی تو ان کے دوست نے نوشابہ (بوتل) پی۔ جب بل آیا تو کوئی 28500 ریال تھا اور ان صاحب نے 5000 ریال فی کس کے حساب سے ہم سے 20000 ریال طلب کر لئے۔ یعنی زیادہ کھانے کے باوجود ان دونوں نے صرف 8500 ریال شامل کئے۔ ایران میں کرنسی دو قسم کی ہے ان کے نوٹ اور سکے ریال میں ہیں جو سرکاری کرنسی ہے۔ دوسری کرنسی ''تومان'' ہے۔ دونوں میں فرق صرف ایک ''صفر'' کا ہے یعنی 10000 ریال کا نوٹ 100 تومان ہوگا۔ ہوٹلوں اور دکانوں وغیرہ میں زیادہ ''تومان'' کے نام سے لین دین ہوتا ہے۔ ہر جگہ اشیاء پر قیمتیں زیادہ تر ریال میں لکھی ہوتی ہیں۔ ہوٹل سے کھانا کھانے اور پیسے دینے کے بعد دیگر ساتھیوں نے رائے دی کہ موصوف اور ان کے دوست سے الگ رہا جائے کیوں کہ وہ تو ہم سے پیسے بھی زائد لینے کے چکر میں ہے۔ بعد میں معلوم ہوا وہ صاحب بینک آفیسر ہیں اور ان کے ساتھی ایڈووکیٹ ہیں۔ ہمارے پاس وقت تھا ہم بازار جانا چاہتے تھے مگر علم نہیں تھا کہ کیسے جائیں۔ پھر ''فارسی'' ہمیں واجبی سی آتی تھی۔ ایک ٹیکسی کو روکا اور کہا کہ ہمیں بازار جانا ہے اسے سمجھ نہ آئی پھر مارکیٹ اور شاپنگ سنٹر

کا کہا مگر بات نہ بنی اور وہ چلا گیا۔ ہم پریشان تھے کہ ٹیکسی والے کو کیسے سمجھائیں کہ ہمیں بازار جانا ہے۔ سڑک کے ساتھ ایسے ہی ٹیکسی کے انتظار میں پیدل چلتے گئے۔ ایک کونے میں ہمیں ''کباب'' بنتے نظر آئے۔ گو ہم کھانا کھا چکے تھے مگر سب کی بھوک ابھی باقی تھی۔ ہم وہاں بیٹھ گئے اور اشاروں سے کام چلایا انہوں نے ''فی نفر'' (فی کس) کے حساب سے بتایا کہ کتنے تومان لیں گے۔ ایران میں روٹی دو قسم کی ملتی ہے۔ ایک پلانٹ پر تیار ہوتی ہے جو اخبار کے صفحہ کے سائز میں ہوتی ہے اور باریک بھی یہ جلد ہی سوکھ بھی جاتی ہے۔ دوسری روٹی ہمارے نان کی طرز پر ہوتی ہے مگر سائز ہمارے ہاں چاول ڈالنے والی ڈش جتنا ہوتا ہے۔ اس قسم کی روٹیاں زاہدان کے بازار میں عورتیں فروخت کے لئے رکھ کر بیٹھی نظر بھی آئیں۔ اس چھوٹے سے ہوٹل سے ہم نے کباب جو پاکستانی ''سیخ کباب'' کی طرز پر تھے پلانٹ والی روٹی کے ساتھ کھائے اور ہمارے ہاں کی فانٹا، مرنڈا قسم کی بوتل بھی ساتھ ساتھ پی جو مزیدار تھی۔ یہ مشروب پاکستانی اڑھائی روپے میں دستیاب تھا۔ باہر نکلے تو ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ رکنے پر اس کا ڈرائیور جو 40، 45 سال عمر کا تھا ہمارا مدعا سمجھ گیا اور کہنے لگا ''بازار بزرگ!'' ہمیں اطمینان ہوا تو ہم بیٹھ گئے اور ٹیکسی چل پڑی۔ راستہ میں ڈرائیور نے پوچھا ''پاکستان سے آئے ہیں؟''۔ اس نے اثبات میں ہمارا جواب پا کر بتایا کہ بہت پہلے وہ لاہور گیا تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ زاہدان ایران کے صوبہ سیستان و بلوچستان میں واقع ہے اور یہاں زیادہ تعداد سنی العقیدہ مسلمانوں کی ہے۔ باقی ایران میں شیعہ اکثریت میں ہیں۔ پھر وہ مختلف حوالے دے کر کہہ رہا تھا کہ سنی زیادہ بہتر مسلمان ہیں جو ہم خاموشی سے سنتے رہے۔ اتنے میں اس نے اشارہ کیا کہ وہ سامنے بازار ہے میں آپ کو وہاں اتار کر واپس بائیں ہاتھ پر واقع ٹیکسی سٹینڈ پر آ جاؤں گا۔ واپسی پر میرے ساتھ چلئے گا۔ میں انتظار کروں گا۔ ہم نے اسے رقم دی اور وہ ہمیں بازار میں سڑک پر اتار کر واپس مڑ گیا۔

بازار بہت خوبصورت تھا۔ دکانیں نہایت سلیقے سے سجائی گئی تھیں۔ خواتین اور بچوں کا رش تھا۔ ہمارا خریداری کا پروگرام تو نہیں تھا مگر جوتوں والی ایک دکان میں جا کر ہم نے اچھے

سے جوڑے کی قیمت ''بھاؤ ایں چند است'' کہہ کر پوچھی۔ دکاندار نے جو قیمت بتائی وہ 250 روپے پاکستانی بنتے تھے۔ پھر قالینوں وغیرہ کی قیمتیں معلوم کیں اور یقیناً وہ ہماری مارکیٹ کے حساب سے سستے تھے۔ گھومتے ہوئے ہم کپڑوں کی مارکیٹ میں آ گئے جہاں پر بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ تھان میں کپڑوں کے علاوہ ان کے پاس سلے سلائے قمیض وغیرہ بھی تھے۔ زاہدان اور اس کے گردونواح کے علاقہ میں ہمارے ہاں کے بلوچی طرز کے کپڑے پہننے کا رواج ہے یعنی شلوار قمیض ڈھیلی ڈھالی پہنتے ہیں۔ پڑھے لکھے پینٹ شرٹ میں نظر آتے ہیں۔ پہناوے اور وضع قطع کے اعتبار سے یہاں بلوچستان کے علاقہ کا گمان ہوتا ہے اور یہ منی بلوچستان محسوس ہوتا ہے۔ کپڑا وہاں زیادہ تر پاکستانی، انڈین اور مصری تھا اور بہترین کپڑا دس روپے (پاکستانی) فی میٹر تھا۔ وہاں ایک پاکستانی دکاندار اُردو بولنے والے خان صاحب نے کہا ''آپ تو چاہے مارکیٹ خرید کر لے جائیں کوئی زیادہ مہنگا نہیں پڑے گا کیونکہ پاکستان میں تو دس روپے میٹر عام کپڑا نہیں ملتا۔ ایران کی کرنسی کی قیمت بہت کم ہے اس لئے ہر کپڑا آپ کے لئے سستا ہے''۔ یہاں عورتوں نے گو اسلامی لباس پہن رکھا تھا مگر یہ بھی دو تین قسم کا ہے۔ امیر، غریب اور ان پڑھ عورتوں کا پہناوا الگ نظر آتا ہے اور پڑھی لکھی عورتیں فیشن کی دلدادہ نظر آتی ہیں۔ زاہدان میں عمارتیں بہت اچھی حالت میں ہیں۔ مضبوط ہیں مگر دو منزلہ سے زائد کوئی نہیں۔ گرد وغبار نہ ہونے کے برابر ہے اور سبزہ پہاڑی علاقہ ہونے کے باوجود خاصا ہے۔ پارک بڑے اہتمام سے بنائے گئے ہیں اور شہر میں ٹریفک بلا رکاوٹ رواں دواں تھی۔ زیادہ تر اشارے مکمل بند نہیں ہوتے۔ مارکیٹ تو بہت بڑی تھی مگر رات ہو چکی تھی۔ ہم نے ٹیکسی لی اور واپس ہوٹل آ گئے۔

ایں دشمن است

ایک رات قیام کے بعد صبح ہم نے عراقی بارڈر کی طرف طویل سفر کا آغاز کرنا تھا۔ ٹورز کے منتظم نے جب ہوٹل سے عراق فون کرنے کے لئے کہا تو کاؤنٹر پر کھڑے ایرانی نے انکار کر دیا۔ وجہ؟ ''ایں دشمن است'' یعنی صدام ہمارا دشمن ہے۔ ایران میں فون خاصا ارزاں ہے۔ ہم نے گذشتہ رات سونے سے پہلے پاکستان گھر فون کیا تو ہوٹل والے نے 3 منٹ کال کے 60 روپے وصول کئے اور سبھی نے اس سہولت سے فائدہ اٹھا کر پاکستان میں بات کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دی۔ صبح تیار ہونے کے بعد ایران میں پہلی دفعہ ناشتہ کرنا تھا۔ ہوٹل سے باہر آئے تو کسی ساتھی نے بتایا کہ تھوڑی دور ہوٹل ہے وہاں تخم مرغ (انڈہ) کا آملیٹ تیار کر کے دیتے ہیں۔ ہم چاروں وہاں پہنچ گئے۔ آملیٹ، روٹی اور ساتھ میں چائے کی بجائے نوشابہ (بوتل) سے ناشتہ کیا۔ واپس آئے تو بسیں پہنچ چکی تھیں۔ ہوٹل میں اوپر کمرے سے اپنا سامان اٹھایا اور ایک بس میں سوار ہو گئے۔ ایرانی بسیں واقعی سفر کے لائق ہیں سیٹیں آرام دہ اور کشادہ ہیں۔ ایک بس میں تقریباً 34 آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ بس کے درمیان میں چار سیٹوں پر ہم نے ڈیرے ڈال لئے۔ سب لوگ بیٹھ چکے تو ڈرائیور ہماری بس کو دوسری طرف سڑک پر واقع ٹرمینل (بس اسٹینڈ) لے گیا۔ اس کے پیچھے دوسری بس بھی وہاں آ گئی اور ایرانی ڈرائیور حضرات نے طے شدہ کرایہ سے زائد مانگنا شروع کر دیا۔ گھنٹہ بھر ''ٹور'' منتظمین اور ڈرائیورز کے درمیان بحث وتکرار ہوتی رہی بالآخر ہم روانہ ہوئے۔ اس عرصہ میں، میں نے اور راشد نے گیٹ کے ساتھ خالی سیٹ پر قبضہ کر لیا تاکہ سامنے سے اِردگرد کا نظارہ کرنے میں آسانی رہے۔ یہ سیٹ ڈرائیور اور اس کے ساتھیوں نے اپنے لئے خالی کروا رکھی تھی اور ہمارے برابر والی خالی سیٹ پر انہوں نے بعد میں اپنی دو خواتین کو بٹھا لیا۔ بس کے ساتھ چار افراد تھے

ان کے نام خدارا، ناصر، ابراہیم اور انور تھے۔ یہ چاروں ڈرائیور تھے اور ایک ہی فارم پر ان کا لائسنس بنا ہوا تھا جو انہوں نے راستہ میں ایک جگہ پولیس کو دکھایا۔ ہماری بس آبادی سے باہر نکلی تو فلنگ سٹیشن سے اس میں ڈیزل ڈلوایا گیا۔ ایران میں ڈیزل 2 تومان کا لیٹر اور پٹرول کی قیمت اڑھائی تومان ہے یعنی بیس روپے پاکستانی کا لیٹر ہے۔ اس پر وہ ایرانی کہہ رہے تھے ''ابھی یہ مہنگا ہو گیا ہے''۔ بس میں سوار ہونے والے دروازہ کے ساتھ ہی پینے کے لئے پانی کا بڑا سا ٹب رکھا گیا تھا جس میں آدھا پانی اور باقی برف کے دو چھوٹے بلاک ڈال کر ایرانی نے اوپر سے بند کر دیا۔ ایرانی پانی بہت ٹھنڈا پیتے ہیں۔ ہوٹلوں میں بھی ''آب یخ'' لا کر دیتے تو ہمیں مجبوراً اس میں سادہ پانی ملانا پڑتا تھا۔ شہر کے باہر چیک پوسٹ پر کاغذ وغیرہ دکھانے کے بعد ہماری بس ہائی وے پر رواں دواں تھی۔ اس دوران بس کے اندر کراچی کے بابا افضالی اور امین بھائی نے ماحول خوشگوار کر دیا اور انہوں نے پیر اور مرید بننے کے بعد بس میں موجود تمام خواتین وحضرات میں ٹافیاں تقسیم کیں۔ ایرانی خواتین یہ ہلہ گلہ دیکھ کر محظوظ ہوئیں اور دلچسپی لینے لگیں۔ میں نے اور راشد نے خدارا سے ہلکی پھلکی بات چیت شروع کی کیوں کہ وہ تھوڑی تھوڑی اُردو جانتا تھا۔ دونوں ایرانی خواتین جن کی عمر 25 اور 30 سال کے درمیان تھی کے پاس ایک ایک بچہ تھا۔ کم عمر خاتون کے پاس چھ ماہ کا بہت صحت مند بچہ تھا جسے خدارا نے گود میں اٹھا لیا۔ چونکہ وہ ہمارے سامنے اور ساتھ ہی کھڑا تھا اس لئے میں اور راشد بچے کو پیار کرنے لگے۔ بچہ تھا بھی پیارا، عمر تو چھ ماہ تھی مگر سال بھر کا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے نام پوچھا تو خدارا نے اس کا نام ''محمد'' بتایا۔ کچھ دیر بعد ہم نے اسے اٹھا لیا اسے بہلاتے رہے۔ یہ دیکھ کر اس کی والدہ بھی مسکراتی رہی۔ دوسرے بچے کا نام میں نے خاتون سے پوچھا تو اس نے ''اسماعیل'' بتایا اور اس کی عمر ایک سال تھی مگر خاتون نے کہا ''ایں مریض'' یعنی ''یہ بیمار ہے''۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ چاروں ڈرائیور حضرات اور دونوں خواتین ایک ہی خاندان سے ہیں۔ انہوں نے زاہدان سے ایک فلاسک میں چائے بھر لی تھی اور بچوں وغیرہ کے لئے 4 نوشابہ (بوتل) رکھ لی تھیں۔ ابراہیم ڈرائیونگ کر رہا تھا اور انور پیچھے سپیشل سیٹ پر سو رہا تھا جب کہ

خدارا اور ناصر کو ہم نے باتوں میں لگا رکھا تھا۔ بچوں کی بات ہوئی تو ہم نے ''خدارا'' سے پوچھا کہ ناصر کی شادی ہوئی ہے؟ اس نے بتایا کہ نہیں، یہ جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے اس کا باپ نہیں مانتا۔ یہ 3لاکھ تومان دے گا تو اس کی شادی ہوگی۔ لڑکے کو یہ رقم لڑکی کے باپ کو دینا پڑتی ہے۔ تب ہمیں اندازہ ہوا کہ جیسے پاکستان میں چند علاقوں کے باشندے روپے لے کر لڑکی کی شادی کر دیتے ہیں یہاں بھی وہی سلسلہ ہے۔ بات کو مذاق میں آگے بڑھاتے ہوئے خدارا نے کہا کہ میں نے اسے یعنی ناصر کو کہا ہے کہ 3لاکھ مجھے دے دو میں لڑکی کے باپ کا کام تمام کر دیتا ہوں اور تمہاری شادی ہو جائے گی۔ ورنہ آج کل شادی پر جتنا خرچہ آتا ہے یہ اتنی رقم زندگی بھر جمع نہیں کر سکتا۔

میں نے پوچھا تمہارے ہاں شادی پر کتنا خرچہ آ جاتا ہے؟ خدارا نے اندازہ لگا کر بتایا کہ 15لاکھ خرچ ہوتے ہیں یعنی یہ پاکستان لاکھ سوا لاکھ روپیہ بنتا ہے۔ میں نے مزید پوچھا ''شادی پر خوب ہنگامہ ہوتا ہے کھانا اور رسمیں وغیرہ؟''۔ ''ہاں بڑا کھانا دیتے ہیں، سونا بہت ڈالتے ہیں مگر زیادہ خرچہ لڑکے والوں کو کرنا پڑتا ہے، لڑکی والوں کا کچھ خرچ نہیں ہوتا''۔ خدارا نے تفصیل بتائی تو ساتھ بیٹھا ناصر مسکرا رہا تھا کیوں کہ وہ محض گفتگو سن رہا تھا۔ ملی جلی اُردو کی وجہ سے اسے سمجھ تو آ نہیں رہی تھی۔ میں نے خدارا سے پوچھا تمہاری شادی پر کتنا خرچہ آیا تھا؟ اس نے کہا دس سال پہلے جب اس کی شادی ہوئی تو 5لاکھ خرچ ہوئے تھے۔ بچے کتنے ہیں؟ میں نے ایک اور سوال کیا۔ اس نے ہاتھ کی دو انگلیاں کھڑی کیں اور بولا ''دو دانہ'' یعنی دو بچے ہیں۔

بس کا سفر جاری تھا اور ہم صحرا میں سے گزر رہے تھے دوپہر کے وقت سخت گرم لو چل رہی تھی مگر بس کے اندر اس کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ہائی وے پر ٹریفک اِکا دُکا تھی وہ بھی ٹرالر زیادہ تھے۔ چلتی بس پر ڈرائیور تبدیل ہو گئے۔ ابراہیم کی جگہ ناصر بیٹھ گیا وہ سامنے والے آئینہ سے ہمیں دیکھتا تو میں اور راشد بھی بھی اشارے کرتے کہ گاڑی تیز چلاؤ وہ کافی ہنس مکھ تھا اور ہمارا مذاق چلتا رہا۔ دوپہر کے وقت بھوک سب کو ستا رہی تھی۔ دُور دُور تک کسی آبادی کا نشان نہیں تھا۔ بالآخر ایک جگہ ہوٹل پر بس کو روکا گیا اور ہماری دوسری بس بھی وہاں آ کر رک گئی۔ ایران

میں چونکہ شہر کئی کئی گھنٹوں کی مسافت پر ہیں اس لئے ہائی ویز کے ساتھ بڑے بڑے ہوٹل بنے ہیں جہاں بیک وقت 50 سے 100 افراد بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں۔ ان ہوٹلوں میں بیت الخلاء، وضو اور جائے نماز کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔ اس ہوٹل پر اُبلے ہوئے چاول اور کھٹے ذائقے والی چنے کی دال کے علاوہ انڈہ آملیٹ بنا کر دے رہے تھے۔ بھوک تو کافی تھی مگر بے ذائقہ کھانا زہر مار کیا اور سفر پھر شروع ہو گیا۔ ایران کی ہائی ویز پر چیک پوسٹ بہت ہیں۔ اوسطاً 100 کلومیٹر میں دو چیک پوسٹ تو ضرور ہوں گی جہاں پر کبھی گاڑی کے کاغذات چیک کئے جاتے ہیں۔ کبھی مسافروں کو نیچے اتار کر بس کی تلاشی لی جاتی ہے اور مرضی ہو تو سامان کھلوا کر بھی دیکھتے ہیں۔ اس پر ''خدارا'' نے بتایا کہ اگر پولیس کو وہ 500 تومان دے دیں تو وہ چیکنگ کے بغیر جا سکتے ہیں مگر وہ کیوں دے۔ کیوں کہ اس کے پاس ایسی ویسی چیز ہے ہی نہیں۔ میں نے پوچھا ''یہاں بھی پولیس ماہانہ لیتی ہے؟'' اس نے بتایا کہ پولیس کے بڑے صاحب کو وہ فی بس 200 تومان دیتے ہیں۔ میں نے راشد کو کہا ''سن رہے ہو'' یہاں بھی اللہ کا فضل ہے۔

اگلی صبح میں نے خود ایک چیک پوسٹ پر دیکھا کہ مخالف سمت سے آنے والے ٹرک ڈرائیور نے سپاہی کی مٹھی کو گرم کیا اور چلتا بنا اور پھر اس مٹھی سے پولیس والے کی پینٹ کی بائیں جیب گرم ہو گئی۔ ایران کی ہائی ویز پر مسافر گاڑی 90 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے تیز چلانے پر جرمانہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہماری بس کے سپیڈومیٹر کی سوئی 75، 80 کے ہندسہ پر رہتی تھی۔ جب دوبارہ ناصر ڈرائیور سیٹ پر بیٹھا تو ہم نے اشاروں اشاروں میں کہا کہ پاؤں دبا کر رکھو اور تیز چلاؤ جب بس کی رفتار بڑھتی محسوس ہوئی تو ہم خوش ہوئے۔ مگر شام کے تھوڑی دیر بعد بس ایک بڑی چیک پوسٹ پر رکی تو وہاں ہمیں خاص وقت لگ گیا اور جب ''خدارا'' اور ''ناصر'' وغیرہ واپس آئے تو پتہ چلا کہ اوور سپیڈنگ پر انہیں 600 تومان جرمانہ ہو گیا ہے۔ کیوں کہ سپیڈومیٹر کے نیچے گراف سے گاڑی کی مقررہ رفتار سے تیز چلنے کا پتہ چل جاتا ہے۔ خدارا، ناصر پر برس بھی رہا تھا۔ اب ہائی وے پر رات کا سفر شروع تھا اور ڈرائیور کو بس کی رفتار دن کی نسبت کم رکھنا پڑ رہی تھی۔

اُونچی دکان، پھیکا پکوان

رات کو بھوک بھی ستا رہی تھی مگر کوئی ہوٹل نظر نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر رات کے 10 بجے ہوں گے کہ بس کو سڑک کے کنارے واقع ہوٹل پر پارک کیا گیا۔ دو تین اور بسیں بھی وہاں کھڑی تھیں۔ حسب معمول یہ ہوٹل بھی خاصا بڑا تھا۔ کاؤنٹر پر اُدھیڑ عمر ایرانی نے اشاروں سے بتایا کہ 500 تومان یعنی 45 روپے پاکستانی میں ایک آدمی کو کھانا ملے گا۔ کھانا کیا تھا ''اونچی دکان پھیکا پکوان'' بے ذائقہ اُبلے ہوئے چاول کی پلیٹ اور دو ٹھنڈے کباب، پلانٹ کی تیار شدہ باریک روٹی جس کے اکثر حصے سوکھے ہوئے تھے۔ ہم نے یہ کھانا زہر مار کیا اور ساتھ میں آپس میں باتوں کے دوران ہوٹل والوں کو کوستے بھی رہے۔ کیوں کہ یہاں ایک تو کھانا مہنگا اور بدمزہ تھا دوسرا کاؤنٹر پر کھڑا ایرانی بھی خاص بدمزاج تھا۔ ایک کونے میں چائے کا کاؤنٹر تھا جہاں سے 20 تومان کے عوض پلاسٹک کے کپ میں چائے مل رہی تھی۔ بس کے ڈرائیور حضرات اور خواتین الگ میزوں پر بیٹھے مزے سے کھانا کھا رہے تھے اور ان کے سامنے مشروب (نوشابہ) بھی پڑا تھا جب کہ ہمیں کاؤنٹر سے مشروب مانگنے پر جواب مل گیا تھا۔ کھانے کے بعد یہیں سب نے نمازِ عشاء ادا کی اور پھر ہائی وے پر سفر کا آغاز ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں بس میں موجود خواتین وحضرات میں سے اکثر نے نیند لینے کی کوشش شروع کر دی۔ ہم چونکہ فرنٹ سیٹ پر تھے اس لئے سامنے سے آنے والی گاڑیوں کی لائٹ پڑتی تھی تو آنکھیں چندھیا جاتی تھی۔ رات کے اندھیرے میں سڑک کے ساتھ دور واقع شہروں میں روشنیوں کا نظارہ بہت خوبصورت اور دلفریب تھا۔ یہ روشنیاں ایک خاص ترتیب میں تھیں جس سے واضح تھا کہ آبادی یا کارخانے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بنائے گئے ہیں۔ راشد میرا ساتھ نہ دے سکا اور خواب خرگوش کے مزے لینے لگا۔ آدھی رات کے وقت بس میں جو لوگ

جاگ رہے تھے ان میں میرے علاوہ ڈرائیور، اس کا ساتھی، دونوں خواتین اور ایک دو حضرات اور شامل ہوں گے۔ ڈرائیور چائے اور سگریٹ کا مسلسل استعمال کر رہا تھا۔ اب ہائی وے پر ٹریفک خاصی کم تھی اِکا دُکا گاڑیاں نظر آتی تھیں۔ راستے میں پولیس چیک پوسٹ پر گاڑی لازماً رکتی اور کاغذات کی پڑتال کے بعد آگے بڑھتی۔ میں نے اندازہ لگایا اب تک بس کی 15 سے زائد چیک پوسٹوں پر چیکنگ ہوئی اور کئی جگہ تو ہمارے پاسپورٹ بھی دیکھے گئے۔

رات ڈیڑھ بجے بس ایک چیک پوسٹ پر رکی تو ہمارے سے پہلے دو بسیں وہاں کھڑی تھیں۔ باہر خاصی سردی تھی اور نوجوان سپاہیوں نے پہلے کھڑی ایک بس کے تمام مسافروں کو نیچے اتار کر قطار میں کھڑا کر رکھا تھا۔ خواتین کو البتہ نیچے نہیں اتارتے تھے۔ سڑک کے ساتھ ہی بڑی سی عمارت تھی وہاں مسلح محافظ کھڑا تھا۔ باہر کی سرد ہوا سے بچنے کے لئے ایک ایرانی نوجوان نے اس عمارت کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہونا چاہا تو ایک سپاہی نے اسے منع کیا اور پرے دھکیل دیا۔ وہ ایرانی نوجوان بھی غصے میں آ گیا اور ''تو تو میں میں'' کے بعد سپاہی نے اسے گریبان سے پکڑا اور ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے اور اٹھا کر اسے عمارت کے جنگلہ نما گیٹ سے اندر دھکیل دیا۔ میں یہ منظر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا ہمیں بھی اس سردی میں نیچے اترنا پڑے گا؟ خیر بعد میں نوجوان کو انہوں نے باہر نکال کر بس میں سوار کرا دیا۔ ہماری باری آئی تو ڈرائیور نے بتایا کہ مسافر پاکستانی ہیں اور اپنے کاغذات دکھائے تو نوجوان سپاہی نے تمام مسافروں پر نظر ڈالی اور جانے کا اشارہ کر دیا۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے بورڈ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اب ہم اصفہان پہنچیں گے مگر نماز فجر ہمیں اس سے 25 کلومیٹر باہر ہی ادا کرنا پڑی۔

اس سے قبل دونوں ایرانی خواتین کو ان کے بچوں نے تمام رات چین نہیں لینے دیا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ بچے سو جائیں اور وہ بھی کچھ پل کے لئے نیند لے لیں مگر اس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ انہوں نے بچوں کو سیٹوں کے درمیان میں کپڑا بچھا کر لٹایا مگر وہ بار بار اُٹھ جاتے اور مائیں انہیں سلانے کی پھر سے کوشش شروع کر دیتیں۔ ایک دو

بارتو میں نے بڑے بچے اسماعیل کے اُٹھ کر بیٹھ جانے کی اطلاع اس کی سوئی ہوئی ماں کو دی جس نے پھر سے اسے سلایا۔ مگر آفرین ہے ان خواتین پر کہ انہوں نے بچوں کو اُف تک نہیں کہا اور نہ ہی سختی کی کوشش کی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا اور ہم اصفہان شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ شہر خاصا خوبصورت تھا اور سبزہ بہت تھا۔ صبح سویرے چھوٹی گاڑیوں پر فروٹ لاد کر غالباً منڈی سے لایا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم مرکزی شہر میں مختلف شاہراہوں پر گھوم رہے تھے۔ یہ وقت لوگوں کے دفتر وغیرہ اور طلباء کے تعلیمی اداروں میں جانے کا تھا۔ مگر باغات، پارکوں اور ہری بھری جگہوں میں خاصے لوگ ابھی ورزش اور چہل قدمی میں مصروف تھے۔ عمر رسیدہ افراد بھی بڑی تعداد میں ''مارننگ واک'' کرتے نظر آئے۔ کچھ خاموشی سے پارک کے بنچوں بیٹھے تھے۔ سڑکیں کشادہ اور ٹریفک یکطرفہ تھی۔ چوک اور گول چکر کے آس پاس خاصی گہما گہمی تھی جہاں غالباً بس سٹاپ تھے اور طلباء وطالبات تعلیمی اداروں میں جانے کے لئے بسوں کے انتظار میں تھے مگر ایک خاص بات جو اصفہان میں دیکھنے کو ملی وہ یہ کہ ٹیکسیز میں ایک آدمی بھی بیٹھ سکتا ہے یعنی تین لوگ بیٹھے ہیں تو چوتھے بیٹھنے والے کو بھی ٹیکسی ڈرائیور اس کی منزل پر اتارنے کے لئے بٹھا لے گا۔ بس کے ڈرائیور اور اس کے ساتھیوں کو اصفہان شہر سے باہر نکلنے کا راستہ یاد نہیں رہا تھا۔ کیوں کہ وہ کافی عرصہ کے بعد اس طرف آئے تھے۔ اس کشمکش میں متعدد جگہوں سے یہ معلوم کرنے کے باوجود کہ شہر سے باہر کس سڑک سے جائیں، کامیابی نہ ہو سکی۔

اصفہان کی چائے

گاڑیاں اصفہان کی شاہراہوں پر چکر کاٹتی رہیں اور اسی بہانے ہم نے شہر کا کافی حصہ دیکھ لیا۔ ایک گول چکر پر پولیس والے نے بس کو روک لیا اور ایک طرف کرنے کا اشارہ کیا۔ اس دوران اچھی خاصی ٹریفک رکی رہی مگر کسی نے ہارن بجایا نہ ہی اِدھر اُدھر سے نکلنے کی کوشش کی۔ ٹریفک سارجنٹ نے کتاب نکالی اور اس پر لکھنے لگا۔ یہ دیکھ کر ''خدارا'' نیچے اُترا اور سارجنٹ کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ راستہ بھول گئے ہیں اور غلطی سے اِدھر آئے ہیں مگر اسے معافی ملنی تھی نہ ملی۔ جب وہ واپس بس میں آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھپی ہوئی چٹ تھی اور وہ غصے میں بھی تھا۔ اتنے میں پچھلی سیٹوں سے کسی نے کہا کہ اصفہان آئے ہیں اور اتفاق سے راستہ بھول گئے ہیں تو کہیں سے ''اصفہانی چائے'' ہی پی لیں۔ مگر ڈرائیور ناصر اور خدارا نے یہ بات سنی ان سنی کر دی۔ میں نے ڈرائیور حضرات کی پریشانی اور موڈ کو بھانپ کر چائے پینے کا مشورہ دینے والوں کو خاموش رہنے کی درخواست کی کہ کہیں یہ لوگ زیادہ برا نہ مان جائیں۔ تب میں نے وہ چالان کی چٹ اٹھا کر دیکھی تو اس میں فارسی زبان میں قانون شکنی کی فہرست کے 15 نمبر تھے جن کے سامنے جرمانہ کی رقم بھی درج تھی۔ ہماری بس کا چالان ممنوعہ جگہ داخلہ پر ہوا تھا اور جرمانہ 1000 تومان تھا۔ اس کے بعد بھی ہم متعدد سڑکوں پر چکر کاٹتے رہے مگر شہر سے باہر نہ نکل سکے۔ شہر کی عمارتیں بلند و بالا اور خوبصورت تھیں۔ صفائی بھی اچھی خاصی تھی۔ یہاں کاریں زیادہ تعداد میں رواں دواں تھیں۔ صبح کے بھولے ہم 10 بجے شہر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے اور اب سبھی کو بھوک نے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے تو ڈرائیور نے ہمارے کھانے کے لئے کہیں رکنے کی درخواست پر بس اس لئے نہ روکی کہ وقت برباد اور چالان ہونے سے اس کا موڈ آف تھا۔ پھر جب اس نے

ایک دو جگہ ہوٹل پر روک کر معلوم کیا تو وہاں کھانا دستیاب نہیں تھا اور ہم ایک بار پھر پہاڑوں کے درمیان محوِ سفر تھے۔ خشک پہاڑوں کا سلسلہ جس کے اردگرد رہائشی مکانات تھے اور بکریاں کثرت سے نظر آتی تھیں۔ ''بردجرد'' نامی علاقہ اور اس کے نواح میں پہاڑوں پر سے گندم کی کٹائی کے بعد قدیم پنجابی طریقہ کار کے مطابق دانے نکالے جا رہے تھے۔ گندم کی یہ فصل وسیع پیمانے پر نہیں تھی کہیں کہیں ایک مرد اور عورت بھوسہ اُڑا کر دانے نکال رہے تھے۔ اس علاقہ میں سبزی کی کاشت خاصی نظر آتی تھی اور تربوز بھی بہت تھا۔ ظہر کے وقت جب سب کا بھوک سے بُرا حال ہو گیا تو ''گرود'' نامی قصبہ میں ایک ہوٹل پر بس رکی تو پلک جھپکنے میں خواتین وحضرات ہوٹل کے اندر تھے۔ کاؤنٹر پر بیٹھا پکی عمر کا ایرانی خاصا تیز تھا۔ ہم نے اسے کہا کہ پہلے نماز پڑھ لیں پھر کھانا کھائیں گے۔ یہاں بھی وہی کھانا تھا اُبلے چاول اور چلو کبابی (سیخ کباب) اور اس کے ساتھ ٹماٹر کے چار ٹکڑے کر کے ہلکی آنچ پر گرم کر کے دے رہے تھے اور فی کس 40 ریال بل تھا جو کاؤنٹر پر پیشگی وصول کیا گیا۔ ہوٹل کا ایک نوعمر بیرا ہم سے ہنس ہنس کر فارسی میں بات کرنے کی کوشش کرتا مگر ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کہا کہ ''پاکستانی اخبار'' ہم نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ یہ پاکستانی اخبار کیا کرے گا! اور ہمارے پاس تھا بھی نہیں مگر اس نے کئی مرتبہ مطالبہ کیا تو میں نے عارف سعید سے پوچھا کہ وہ جمعہ کا اخبار کہاں ہے جو میں نے اسے کوئٹہ میں دیا تھا تو اسے یاد آیا کہ وہ اس کے بیگ میں ہے۔ میں نے کہا نکال کر اسے لا دو۔ اخبار میں میگزین بھی تھا جسے دیکھتے ہی لڑکے کا چہرہ کھل اٹھا اور اس کے دوسرے دو ساتھی لڑکوں نے بھی دو دو صفحات اچک لئے اور تصاویر دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ اب وہ ہمیں پھرتی سے کھانے کی چیزیں لا کر دے رہا تھا۔ بس ڈرائیورز اور خواتین نے الگ کونے میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور سب لوگ کھا چکے تو بس میں بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ ہم نے بھی سیٹ سنبھال لی مگر نیچے شور سا سنائی دیا دیکھا تو ہوٹل والا ڈرائیورز کو روکے کھڑا تھا اور کسی چیز کا تقاضہ کر رہا تھا مگر ناصر اور خدارا وغیرہ انکار کر رہے تھے۔ میں نے نیچے اُتر کر انجم صاحب سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہوٹل والا ان سے کھانے کے پیسے

مانگ رہا ہے اور یہ اس لئے نہیں دے رہے کہ ہوٹل پر ڈرائیورز ''فری'' کھانا کھاتے ہیں۔ جب کہ ہوٹل والے ایرانی کا مؤقف ہے کہ ان کی خواتین نے بھی ساتھ کھایا ہے لہٰذا یہ اس کے پیسے دیں۔ بات کو ختم کرنے کی غرض سے انجم صاحب نے اپنے پاس سے ''تومان'' دے کر معاملہ رفع کیا۔ جیسے ہمارے ہاں فلائنگ کوچز اور بسوں والے راولپنڈی اور لاہور وغیرہ کے درمیان ہوٹلوں پر گاڑی کھڑی کر کے خود مفت میں کھانا کھاتے ہیں جب کہ ہوٹل والے مسافروں کی کھال کھینچ لیتے ہیں۔ یہی طریقہ واردات ایران میں ہے اور ہوٹل والے 200 تومان کے کھانے کا 450 تومان بل وصول کرتے ہیں۔ ہمیں اس انکشاف پر خاصی حیرت بھی ہوئی۔ جب بس چلنے لگی تو اخبار مانگنے والا بیرا بڑی چاہت اور جوش سے ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں الوداع کہہ رہا تھا۔ ہم نے بھی جواباً ہاتھ ہلا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

پروگرام کے مطابق تو ہمیں آج شام عراق کی سرحد پر پہنچنا تھا مگر اس کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ پہاڑوں پر ''زگ زیگ'' چڑھائی کے باعث بس کی رفتار خاصی کم تھی اور چیکنگ میں بھی کافی وقت ضائع ہو رہا تھا۔ عصر کے وقت ہم ''بلوردی'' نامی قصبہ میں پہنچے جہاں سے بس میں ڈیزل ڈلوایا گیا۔ میں اس دوران نیچے اترا تو ایک ایرانی جو کار سوار تھا، نے پوچھا کہ آپ عراق جانے میں آزاد ہیں؟ ہماری طرف سے بھی وہاں کربلا اور نجف میں سلام اور محبت پیش کرنا۔ میں نے اسے کہا کہ ایسا ضرور کریں گے تو وہ خوش ہو گیا۔ ابھی تک ایرانی باشندوں کو عراق میں داخلہ کی اجازت نہیں اگر کوئی سرحد کے دوسری طرف چلا جائے تو اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ اس لئے ایرانیوں کو جب پتہ چلتا کہ ہم عراق جا رہے ہیں تو وہ حیران ہوتے کہ آپ کو کیسے اجازت ملی! ہم نے ایک آدھ سے کہا کہ پاکستانی پاسپورٹ پر عراق میں داخلہ کی اجازت مل جاتی ہے تو اس نے کہا کہ آپ تو بہت خوش قسمت ہیں۔

شیریں فرہاد کی نہر

شہر کرمان شاہ جو صوبہ کرمان کا دارالحکومت ہے ابھی 25 کلومیٹر دُور تھا۔ ہم مغرب کی نماز ادا کرنا چاہتے تھے کیوں کہ وقت جا رہا تھا مگر بس والے کہہ رہے تھے وہ ہمیں خسروی بارڈر پر چھوڑ کر آئیں گے۔ مگر رات کو وہاں جانا خوار ہونے والی بات تھی کیوں کہ بارڈر صبح 9 بجے سے 5 بجے شام تک کھلا رہتا ہے۔ اس دوران دوسری بس آئی تو ایک باذوق صاحب نے مشورہ دیا کہ یہاں ''شیریں فرہاد'' کی رومانی داستان سے متعلق ''نہر'' ہمیں دکھائی جائے۔ رات کا اندھیرا شروع ہو چکا تھا اور برقی قمقموں میں پورا شہر کرمان شاہ جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ پورے شہر میں درخت اور ہریالی بہت تھی۔ شاہراہیں کشادہ اور منظم تھیں۔ بسیں شہر کے اندر ایک جگہ کھڑی کر کے ہمیں کہا گیا کہ وہ پارک آ گیا ہے جہاں خسرو پرویز کی کنیز شیریں کو پانے کے لئے ''فرہاد'' کی پہاڑ سے کھودی ہوئی نہر موجود ہے۔ سب لوگ نیچے اُترے۔ پہلا کام نماز پڑھنے کا کیا۔ لوگ ہمیں دیکھ رہے تھے کہ یہ کہاں نماز پڑھ رہے ہیں کیوں کہ پارک کا گیٹ تو بند ہو چکا تھا اور ہم نے سڑک پر ہی نیت باندھ لی تھی۔ فارغ ہوئے تو چیونگم اور مکئی کے بھٹے بیچنے والے بچوں نے گھیر لیا۔ یہاں پر ''فیملیز'' آ رہی تھیں اور گھوم پھر کر جا رہی تھیں۔ ہمارے پارکس کی طرح یہاں منچلے نوجوان بھی خاصے سرگرم تھے۔ ہم نے آگے جا کر دیکھا تو گیٹ پر تالا پڑا تھا۔ پتہ چلا کہ شام (مغرب) کے وقت یہاں داخلہ بند ہو جاتا ہے۔ لوہے کے جنگلے سے دیکھا تو سامنے بلند پہاڑ تھا جسے ''کوہ بے ستوں'' کہا گیا ہے۔ تا حدِ نظر اونچا تھا اور اس کے ساتھ جھیل کی طرز پر پانی بھی دکھائی دیا۔ میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ یہ ''نہر'' کا پانی ہے تو اس نے سامنے اشارہ کر کے بتایا کہ نہر نکالنا تو محض تشبیہ ہے۔ دراصل فرہاد نے اس بلند و بالا اور مضبوط پہاڑ کو کاٹنے کی کوشش میں تیشہ چلایا تھا جس کا نشان اس وقت ہلکا سا نظر آ رہا ہے۔ اب دونوں بسوں کے ڈرائیوروں میں

تکرار جاری تھی۔ ایک کہہ رہا تھا کہ یہ ہمیں مزید رقم ادا کریں گے اگر ہم رات یہاں ہوٹل میں ٹھہر کر صبح انہیں بارڈر پر چھوڑ آئیں مگر ہماری بس والے مان نہیں رہے تھے۔ وہ کہتے کہ ہم رات کو بارڈر پر چھوڑ کر واپس جانا چاہتے ہیں کیوں کہ ان کے ساتھ عورتیں ہیں اس لئے وہ یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ انجم صاحب اور دیگر چند ایک اصحاب نے کہا کہ ٹھیک ہے وہ واپس چلے جائیں۔ مگر وہ کہنے لگے کہ ہمیں لکھ کر دو کہ ہم نے مسافروں کو مقررہ جگہ چھوڑا ہے۔ ایران میں بس سٹینڈ پر ذمہ دار افراد باقاعدہ اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ بس مسافروں کو جس منزل پر لے کر گئی ہے وہاں انہیں پہنچایا ہے یا نہیں۔ بہرحال کافی بحث کے بعد بسیں اندرون شہر کسی ہوٹل پر جانے کے لئے چل پڑیں۔ کرمان شاہ بھی قدیم و جدید امتزاج کا شہر دکھائی دیا۔ پرانی طرز کی مضبوط عمارتیں بھی تھیں اور پہاڑی پر بنے جدید خوبصورت پارک بھی۔ ایک دو ہوٹلوں میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ سب لوگ ٹھہر سکیں۔ آخرکار ''آزادی چوک'' میں واقع ہوٹل میں قیام کا فیصلہ ہوا۔ بس سے اپنا سامان اٹھا کر میں اور راشد سب سے آخر میں اُترے اور دونوں ایرانی خواتین کو ہم نے خدا حافظ کہا۔ انہوں نے بھی بڑے خلوص سے شکریہ ادا کیا۔

ہوٹل کی دوسری منزل پر ہمارا کمرہ تھا۔ کمرے میں سامان رکھنے کے بعد راشد نے کہا یار ان خواتین کے بچوں کو کچھ دینا چاہئے انہوں نے پورے سفر میں ہماری بڑی عزت کی ہے۔ تحفہ وغیرہ تو ہے نہیں، کچھ ایرانی کرنسی دے دیتے ہیں۔

میں نے کہا یہ تو ہمارا پاکستانی رواج ہے وہ اچھی خاصی کھاتی پیتی خواتین ہیں کرنسی سے برا نہ مان جائیں۔ میں تو ایسا نہیں کروں گا تم جو مرضی ہے کرو۔ کھاتی پیتی خواتین اس لئے تھیں کہ ایک تو ہمیں بتایا گیا تھا کہ وہ اس بس کی مالک ہیں، دوسرا راستے میں مجھے فیصل آباد کے یٰسین چاند نے کہا کہ میں بڑی عمر کی خاتون کے ہاتھ پر لگی راڈو گھڑی کی قیمت تو معلوم کروں تو اس پر بھی لطیفہ ہو گیا۔ میں نے فارسی میں گھڑی کی قیمت کے بارے میں پوچھا تو خاتون نے وقت بتا دیا۔ غالباً اسے سمجھ نہیں آ سکی تھی۔ یٰسین نے کیلکولیٹر پر حساب لگایا تو قیمت بہت کم بنتی تھی اسے یقین نہ آیا۔ دو مرتبہ پھر میں نے قیمت پوچھنے کی کوشش کی مگر اس بار خاتون نے لکھ کر بتایا مگر یہ بھی وقت تھا۔ ہم پریشان ہو گئے۔ اتنے میں ''خدارا'' آیا تو میں

نے کہا کہ گھڑی کی قیمت کا معلوم کرنا تو جب اس نے خاتون کو بتایا کہ یہ قیمت پوچھ رہے ہیں تو وہ بھی شرمندہ سی ہوگئی اور خدارا نے بتایا کہ گھڑی 35 ہزار روپے کی ہے۔

راشد نیچے گیا تو بس ابھی کھڑی تھی اور اس نے واپس آ کر بتایا کہ دونوں بچوں کو اس نے 500 تومان دیئے تو خواتین بہت خوش ہوئیں اور بار بار شکریہ ادا کرتی رہیں۔ ہوٹل میں پہلا کام ہم نے نہانے کا کیا۔ عارف سعید اور بشیر اعوان کا کمرہ ہمارے ساتھ والا تھا اور اس میں باتھ بھی تھا جس میں گرم پانی آ رہا تھا۔ کپڑے بدلنے کے بعد نیچے آئے اور کچھ کھانے پینے کا سوچا تو کسی نے بتایا کہ ساتھ ہی جوس کی دکانیں ہیں، مزیدار جوس سستا بھی ہے۔ پلاسٹک کے ڈسپوز ایبل گلاس میں گاجر اور خربوزہ کا جوس نکال کر دینے والی تین چار دکانیں ساتھ ساتھ تھیں۔ ایک جگہ سے خربوزہ کا جوس لیا جو 5 روپے فی گلاس تھا اور خاصہ مزیدار بھی۔ ایک ایک گلاس سے بات نہ بنی تو دوسرا گلاس گاجر جوس کا لے لیا اور پینے کے بعد سب اس کی تعریف کر رہے تھے۔ رات کے 10 بجے چوک میں خاموشی تھی۔ پھول وغیرہ اُگا کر چوک کو خوبصورت بنایا گیا تھا۔ درمیان میں ٹریفک پولیس کی چوکی تھی جہاں پٹرولنگ کے لئے گاڑی بھی موجود تھی۔ کچھ دیر گھومنے کے بعد جب آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو ہوٹل آ کر سو گئے۔ صبح جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے اور ہمیں کہا گیا کہ سامان وغیرہ آٹھ بجے تک نیچے لے آئیں۔ گاڑیاں آ رہی ہیں اور ہمیں روانہ ہونا ہے۔ سامان اتارتے وقت گذشتہ رات کسی نے غلطی سے ایک ایسا بیگ بھی اٹھا لیا جس کے مالک کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اسے کھول کر دیکھا تو خواتین اور بچوں کے کپڑے وغیرہ تھے جس سے معلوم ہوا کہ یہ تو ان ایرانی خواتین کا ہے اور وہ تو جا چکی تھیں۔ راشد کو اس بات کا بڑا افسوس ہوا کہ وہ کیا سوچیں گی کہ پاکستانیوں نے ان کا بیگ اٹھا لیا! حالانکہ ایسا دانستہ نہیں ہوا تھا۔ کرمان شاہ میں جو لڑکے تعلیمی اداروں میں جا رہے تھے ان کے ہاتھ میں کتابوں کے ساتھ تسبیح بھی تھی جو فیشن زیادہ لگ رہی تھی۔ یہاں ہمیں ناشتہ میں کلیجی کے تکے اور روٹی دستیاب ہوئی جو مزیدار تھی۔ ساتھ میں چائے بغیر دودھ پی کر ہم منی بسوں میں سوار ہو گئے۔ دن کی روشنی میں کرمان شاہ شہر کو دیکھا تو اور بھی خوبصورت لگا جہاں زندگی بڑی خوبصورتی سے رواں دواں تھی۔

ایران میں اسلام آباد

کرمان شاہ کے بعد اسلام آباد نامی شہر آیا جو اتنا بڑا نہیں تھا مگر ہمارے اسلام آباد کی طرح صاف اور خاموش ضرور تھا۔ سڑکوں پر سلیقے سے سبزہ اُگا ہوا تھا اور خوبصورت لائٹیں لگائی گئی تھیں۔ اب ہم ایران عراق سرحد کے علاقہ میں تھے جہاں دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کے دوران ہونے والی تباہی اور قائم فوجی چوکیاں نظر آ رہی تھیں۔ متعدد جگہ گاڑیوں کو روک کر پوچھ گچھ کی گئی ان چوکیوں پر ہم کھڑے فوجیوں کو جو زیادہ تر نوجوان تھے ہاتھ ہلا کر السلام علیکم اور خدا حافظ کہتے تو وہ خوشی سے اس کا جواب دیتے۔ ہم نے خسروی بارڈر پہنچنے تک اپنا یہ سلسلہ جاری رکھا اور شغل بھی کرتے رہے۔ پہاڑوں کے درمیان سڑک کی حالت بہت اچھی تھی اور بہتر منصوبہ بندی سے بننے کی وجہ سے زیادہ موڑ بھی نہیں تھے۔ ایک بجے جب ہم عراقی سرحد کے ساتھ ملنے والی جگہ خسروی پہنچے تو خاصی گرمی تھی اور حکومت ایران نے وہاں لوگوں کے بیٹھنے کے لئے کافی بڑا کیبن بنایا تھا جس میں عورتیں الگ بیٹھ سکتی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کے لئے ایئر کولر تھا مگر اس میں پانی نہیں تھا اور ہوا گرم آ رہی تھی۔ ایران میں گرمی خاصی پڑتی ہے اور چھوٹے بڑے شہروں میں لوگوں نے ''کولنگ'' کے لئے ایئر کولر چھتوں پر لگا کر ان کی ہوا تمام کمروں میں ڈکٹ کے ذریعے پہنچانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ ویسے یہ طریقہ ''کم خرچ بالانشیں'' تھا۔ بارڈر پر پینے کے پانی کے ٹینک بھی تھے جن میں برف کے بلاک ڈالے ہوئے تھے اور سخت گرمی میں ٹھنڈا پانی بڑی نعمت تھا۔ پاسپورٹس کے ہمراہ خروج کے چھوٹے فارم پُر کر کے دفتر میں دیئے گئے تو عصر کے بعد یہ ہمیں واپس ملے۔ سامان کی چیکنگ کے بعد گاڑیوں نے دو تین چکروں میں ہمیں عین عراق کی سرحد پر پہنچا دیا جہاں سے ہم پیدل عراق کی حدود میں داخل ہو گئے۔ اس طرف جنگ کے دوران جو عمارتیں تباہ ہو گئی

تھیں وہ اسی حالت میں تھیں۔ جب کہ ایران نے اکثر کو دوبارہ تعمیر کرلیا ہوا تھا۔ چیک پوسٹ سے ایک فرلانگ فاصلہ پر بڑی سی عمارت میں ہمیں اپنا سامان وغیرہ چیک کروانا تھا وہاں پہلے سے ہمارے میزبان ٹریول ایجنٹ موجود تھے۔ چونکہ پروگرام کے مطابق ہمیں گذشتہ روز عراق پہنچنا تھا اس لئے یہ لوگ کل بھی انتظار کرنے کے بعد رات کو لوٹ گئے تھے۔ سیمنٹ کے بنے کاؤنٹر پر سب نے اپنا سامان کھول کر رکھ دیا اور عراقی حکام نے کیمرے، ٹیپ ریکارڈر اور کیسٹس وغیرہ الگ منگوالیں اور پاسپورٹ پر اندراج کے بعد صرف کیمرے واپس کئے۔ جس سے ٹیپ اور کیسٹس وغیرہ رکھنے والے احباب بہت سٹپٹائے۔ یہاں پر عراقی فوجی ہر ایک سے سگریٹ اور عطر مانگ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ چیکے سے اگر کوئی چیز ہے تو انہیں دے دیں۔ نفی میں جواب ملنے پر مایوس سے ہو جاتے۔ پیاس بجھانے کے لئے یہاں الیکٹرک واٹر کولر میں ٹھنڈا پانی دستیاب تھا۔ میں پانی پی رہا تھا کہ ایک عراقی فوجی نے میری جیب پر لگی پنسل فقیرانہ انداز میں مانگ لی۔ میں نے اسے دے دی تو اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر فوراً جیب میں ڈال لی۔ نماز مغرب تک ہم اپنے پاس موجود کرنسی کا ڈیکلریشن فارم اور پاسپورٹس کے ہمراہ انٹری کے فارم جمع کروا چکے تھے جن پر مہریں لگ کر آئیں تو کہا گیا کہ حکام سب کے خون کا نمونہ لیں گے۔ 2 سی سی خون حاصل کرنے کا مقصد بتایا گیا کہ ''ایڈز'' ٹیسٹ کریں گے اور اس کی فیس وہ 100 ڈالر فی کس وصول کر رہے تھے۔ اس طریقے سے عراقی حکومت کو روزانہ ہزاروں ڈالر آمدنی ہو جاتی ہے۔ ایڈز ٹیسٹ خدا جانے ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ 9 بجے ہماری ایئر کنڈیشنڈ بسیں بارڈر سے روانہ ہوئیں اور رات کے اندھیرے میں آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ایک قصبہ میں واقع ہوٹل میں ہمیں کھانا کھلایا گیا جو ٹریول ایجنسی کی طرف سے تھا۔ یہاں دال پکی ہوئی تھی غالباً چنے کی تھی اور روٹی ہمارے ہاں والی تھی مگر اس میں نمک بہت تھا۔ چائے یہاں آ کر اب شائیے ہوگئی تھی مگر یہ بھی دودھ کے بغیر البتہ چینی شامل تھی۔ یہاں بازار میں بس سے نیچے اترتے ہی بچوں نے ہم سے مانگنا شروع کر دیا مگر ہمارے پاس عراقی کرنسی نہیں تھی اس لئے کچھ نہ کر سکے۔

بغداد آمد

رات 12 بجے کے بعد ہماری بس بغداد شہر میں داخل ہوئی تو آنکھ کھلی کیوں کہ راستے میں زیادہ تر احباب کو نیند آ گئی تھی۔ اس وقت ہم حضرت امام اعظم (امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) کے مزار کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ڈیڑھ بجے ہم حضرت امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کے مزار کے بالکل سامنے بازار میں جا کر رکے۔ ہوٹلوں کی بکنگ کل کے لئے ہوئی تھی مگر ہم نہیں پہنچے اس لئے مختلف ہوٹلوں میں جیسے جیسے کمرے ملے سب کو ٹھہرا دیا گیا۔ رات کے اس پہر بھی دو فقیر بچے مانگنے کے لئے ہمارے سامنے آ کھڑے ہوئے وہ اشاروں سے کہہ رہے تھے کہ جلدی سے انہیں کچھ دے دو ورنہ پولیس آ گئی تو انہیں پکڑ لے گی۔ چونکہ ہمارے پاس عراقی کرنسی نہیں تھی اس لئے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ باقی رات بسر کرنے کے لئے میں، راشد، عارف اور بشیر ایک کمرے میں اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو گئے۔

صبح نماز فجر کے وقت آنکھ کھلی تو ہمارے سامنے والے کمرہ سے نکل کر گلزار صاحب ساتھ والے دیگر دروازوں پر بھی دستک دے رہے تھے کہ تمام ساتھی نماز کے لئے اٹھ جائیں۔ اپنی دھن میں انہوں نے ایک دروازہ کافی زور سے پیٹا اور کچھ دیر اس کے کھلنے کا انتظار کرتے رہے۔ جب دروازہ کھلا تو اندر سے چھوٹی داڑھی والا آنکھیں مسلتا ہوا عربی نکل آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا گلزار صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور فوراً ہی بلند آواز میں ''انت معافی'' کہنے لگے۔ ہم نے چونکہ پہلے ہی کمرے کا دروازہ کھول رکھا تھا اور یہ منظر دیکھنے کے بعد کافی دیر ہنستے رہے۔ نماز کے اوقات کا تو ہمیں علم نہیں تھا اس لئے فوراً وضو کر کے امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کے مزار پر پہنچ گئے اور وہاں ہمیں قبلہ کی سمت کا بھی علم نہیں تھا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی نیت باندھ لی۔ مزار کے احاطہ میں اپنے اپنے مسلک کے

مطابق خواتین وحضرات نماز اور تلاوت میں مصروف تھے۔ قبر کے گرد بیک وقت سینکڑوں مرد وخواتین اور بچے طواف کر رہے تھے اور چاندی سے بنے گھڑیال کے بوسے لے کر کم از کم چار چکر ضرور پورے کرتے۔ وہاں پر تین چار لمبے قد کے جوان اور اُدھیڑ عمر خادم سرخ رنگ کی ''چچا غالب'' والی ٹوپیاں اور لمبے کرتے پہنے وقفے وقفے سے کھڑے تھے اور بخشیش مانگنے کے علاوہ ان کے ہاتھ میں مختلف رنگوں میں کپڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی تھے۔ جو وہ ہر ایک کے آگے کرتے اگر کوئی عورت یا مرد ایک کترن پکڑ لیتا تو اسے اس کے عوض کچھ دینار بھی دینا پڑتے۔ میرے سامنے بھی ایک اُدھیڑ عمر ''سرکاری خادم'' نے ایک کترن کی جسے پکڑ کر میں آگے بڑھنے لگا تو اس نے روک لیا کہ کچھ دیتے جاؤ۔ چونکہ ہم میں سے کسی کے پاس دینار نہیں تھے اس لئے میں نے جھٹ سے وہی کترن دوبارہ اس کے ہاتھ میں دے دی۔ ردعمل میں اس نے ناگواری کا اظہار کیا۔ جیسے ہی ہم مزار کے مرکزی حصہ سے صحن میں آئے تو فقیر بچوں اور عورتوں نے ہمیں گھیر لیا اور اپنی زبان میں بخشیش اور ''فلوس'' مانگنے لگے۔ ہمارے پاس ان کی کرنسی ہی نہیں تھی انہیں کیا دیتے! ایک بچے کو میں نے پاکستانی روپیہ تھمایا تو حیران سا ہو گیا اور دوسرے کو پتہ چل گیا کہ یہ روپے تو ان کے کام کے نہیں مگر اس کے باوجود بڑی مشکل سے بھاگ کر وہاں سے نکلے۔ پھر بھی کچھ عورتیں اور بچے ہوٹل کے باہر تک ہمارے پیچھے آئے۔ یہ علاقہ جہاں حضرت امام موسیٰ رضی اللہ عنہ کا مزار ہے ''الکاظمیہ'' کہلاتا ہے اور یہ عراق کا سب سے قدیم قصبہ ہے۔

تاریخی شہر بغداد جسے ایک ہزار ایک رات (الف لیلۃ ولیلہ) کہا جاتا ہے زندگی کے تمام جدید تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ یورپ اور امریکہ کے بڑے شہروں جیسا پرشور شہر ہے۔ جہاں ٹوکیو کی طرح کشادہ اور پختہ سڑکوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے جس پر کاروں، بسوں اور ویگنوں کی ریل پیل ہے۔ بغداد اس وقت تمام صوبوں کا مرکز اور عراق کا دارالحکومت ہے جس کی آبادی تقریباً پچاس لاکھ ہے اور شہر کی 95 فیصد عمارات گذشتہ 100 سال کے دوران تعمیر شدہ ہیں۔

موجودہ عراق کے اس سب سے بڑے شہر کی بنیاد 762ء میں دوسرے عباسی خلیفہ جعفر المنصور نے رکھی تھی اور اسے اسلامی دنیا کا ایک عظیم الشان دارالخلافہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے اس دور کے ماہرین تعمیرات کو اس شہر کا نقشہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ ایک ماہر تعمیرات نے ایک بڑے دائرے کی شکل میں شہر کا منصوبہ بنایا لیکن خلیفہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ شہر کیسا ہوگا؟ ماہر نے کمال دانائی سے مجوزہ شہر کے اِردگرد چاروں طرف خندق کھدوا کر اس میں لکڑی اور بھوسہ بھر دیا اور اس پر تیل چھڑک دیا پھر خلیفہ کو معائنے کی دعوت دی اور جب خلیفہ مرکز میں پہنچا تو خندق کو آگ لگوا دی گئی اور چشم زدن میں پورے مجوزہ شہر کے محیط میں آگ روشن ہوگئی اور خلیفہ کی آنکھوں کے سامنے نئے ''بغداد'' کا نقشہ اُبھر آیا۔ یہ شہر بعد میں عرصہ دراز تک عظیم عباسی سلطنت کا دارالخلافہ اور علم وفنون کا گہوارہ بھی رہا۔ دریائے دجلہ اس شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوا گزرتا ہے۔ مشرقی حصے کو ''رصافہ'' اور مغربی حصے کو ''کرخ'' کہتے ہیں۔ الرصافہ سرکاری وغیر سرکاری نجی اور تجارتی دفاتر کا مرکز ہے۔ آبادی کا ایک بڑا حصہ بھی اسی علاقے میں دکھائی دیتا ہے۔ زیادہ تر سینما، ہوٹل، شراب خانے، ریستوران، دکانیں اور جوئے خانے شہر کے اسی حصے میں ہیں۔ جبکہ الکرخ میں جدید طرز کے رہائشی مکان، عجائب گھر، سپر ڈیپارٹمنٹل سٹور، مارکیٹیں، گولف کلب، ٹینس کورٹ، سکونتی آبادیاں، بس سٹینڈ، ایئرپورٹ اور ٹیلی ویژن سٹیشن ہیں۔ بغداد ٹیلی ویژن سٹیشن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تمام عرب ممالک میں سب سے پہلا ٹی وی سٹیشن ہے۔

زہرا گارڈن اور مدینۃ العاب جیسی خوبصورت تفریح گاہوں کے علاوہ شارع الرشید بغداد کی سب سے بڑی مصروف اور طویل ترین شاہراہ ہے۔ تیرہ میل لمبی یہ شاہراہ بغداد کو شمال اور جنوب دو حصوں میں منقطع کرتی ہے اور اس کے ہر دو جانب قطار در قطار جدید طرز تعمیر کی خوبصورت وسیع عمارتیں سر اٹھائے کھڑی ہیں۔ بغداد اس اعتبار سے دنیا کے دیگر بڑے شہروں سے قدرے مختلف ہے کہ اس کی عمارتیں فلک بوس نہیں۔ یہ شہر آسمان کی جانب پرواز کرنے کی نسبت زمین پر زیادہ پھیلا ہوا ہے۔

بغداد کے سوق (بازار) شاہراہوں کی طرح کشادہ نہیں ہیں بلکہ بہت تنگ مگر روشن اور پُر رونق ہیں۔ یہاں ہر قسم کے لوگ ہر طرح کے لباس میں ملتے ہیں لیکن زیادہ تر مغربی لباس زیب تن کئے ہوئے لوگ نظر آتے ہیں۔ مرد کوٹ پتلون، قمیض اور ٹائی پہنتے ہیں اور خواتین سکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس اونچی ایڑی کی سینڈل پہنے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔ نوعمر لڑکیاں خصوصاً طالبات باریک نائلون کی سیاہ یا سکن کلر لیگنگ بھی پہنتی ہیں جبکہ شادی شدہ عورتیں پنڈلیوں کو ڈھانپنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں حتیٰ کہ سخت سردی میں بھی۔ بازار میں کچھ لوگ عراقی لباس میں بھی نظر آتے ہیں۔ خواتین (خواہ کسی لباس میں ہوں) گلے یا کلائی میں بڑے نگوں یا رنگ دار منکوں کا ہار پہنے دکھائی دیتی ہیں جبکہ مرد ایسے ہی چمک دار منکوں کی ایک تسبیح ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ بغداد سیاحوں کے علاوہ ادیبوں اور مصنفوں کے لئے بھی خاصی کشش رکھتا ہے۔

بغداد شہر کی آبادکاری سے پہلے الکاظمیہ کو "شینزی" کہتے تھے جس کا عربی میں مطلب "سیاہ فصل" ہے۔ عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور نے 762ء میں جب بغداد کے "سرکلرسٹی" کی تعمیر شروع کی تو اس نے اپنے خاندان کے افراد اور رشتہ داروں کی تدفین کے لئے ایک خاص علاقہ مخصوص کیا جو "قریش قبرستان" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ وہی خلیفہ تھے جنہیں روایت کے مطابق بعد از مرگ دفنانے کے لئے 100 قبریں کھودنا پڑی تھیں۔ یہاں دفن ہونے والوں میں جعفر المنصور کے صاحبزادے خلیفہ الامین اور ہارون رشید کی بیوی زبیدہ خاتون بھی شامل ہیں۔ (قبرستان میں جس جگہ زبیدہ خاتون کا مقبرہ ہے اس کا ذکر آگے ہوگا)۔

الکاظمین اور الجوادین

799ء میں جب امام موسیٰ بن جعفر رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تو انہیں بھی قریش قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ ''الکاظم'' کے نام سے مشہور تھے جس کے معنی ہیں اپنے غصہ پر قابو پانے والا۔ آپ کے پوتے امام محمد الجواد رضی اللہ عنہ کی 834ء میں وفات پر انہیں بھی یہیں دفن کیا گیا۔ تاریخی طور پر پتہ چلتا ہے کہ عباسی خلیفہ المعتصم بلا نے امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کے مزار کی تعمیر کا حکم دیا اور دو گنبدوں کے علاوہ اردگرد کی گیلریاں بنوائیں۔ تاہم 1515ء میں مزار کی تعمیر نو ہوئی اور وقت کے ساتھ ساتھ گیلریوں کی تعداد بڑھتی گئی اور متصل جگہ کو مزار کے احاطہ میں شامل کرنا پڑا۔ اس وقت دو بڑے مرکزی گنبدوں کے اوپر دو دوسرے گنبد ہیں جن پر پوری طرح سونا لگا ہے۔ جب کہ اِردگرد چار بڑے اور چار ہی چھوٹے مینار ہیں جن کی اونچائی اچھی خاصی ہے۔ مزار کی مرکزی عمارت کے اِردگرد خاصہ وسیع صحن ہے جن میں سنگ مرمر لگا ہوا ہے اور پوری عمارت میں نقاشی نظر آتی ہے۔ مزار کے اِردگرد آبادی والا علاقہ ''الکاظمیہ'' کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور دونوں اماموں کو ان کے زہد وتقویٰ اور بلند مرتبہ کی وجہ سے ''الکاظمین'' اور ''الجوادین'' کہا جاتا ہے۔ مزار کی عمارت پُرشکوہ ہے اور مرکزی حصہ میں شیشہ کاری کا خوبصورت کام اپنی مثال آپ ہے۔ مزار کے شمالی دروازے کے ساتھ ہی حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کا شمار حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہونہار شاگردوں میں ہوتا تھا۔ آپ شرعی قوانین کے ماہر تھے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے بھی فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ عباسی خلیفہ ہارون رشید نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی قابلیت اور علم وفضل کے پیش نظر آپ رحمۃ اللہ علیہ کو بغداد کے

بڑے قاضی (تاریخ اسلام کے پہلے چیف جسٹس) کے عہدہ پر مقرر کیا۔ اسلامی نظام عدل و قانون پر ''الخراج'' نامی کتاب آپ رحمۃ اللہ علیہ کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے جو آپؒ نے خلیفہ ہارون رشید کی تحریک پر لکھی تھی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے قاضی (چیف جسٹس) کے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود درس وتدریس اور تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا۔ امام شیبانی، امام احمد بن حنبل اور جاحظ رحمۃ اللہ علیہ آپ کے شاگردوں میں سے تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ تادم آخر بڑے قاضی کے عہدہ پر کام کرتے رہے اور 798ء میں اس دارفانی سے کوچ کیا۔ اس سے ملحقہ خوبصورت مسجد بھی ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر سبز رنگ کی چادر پڑی ہوئی تھی اور اس پر زائرین کی حاضری دونوں اماموں کے مزارات کی نسبت نہ ہونے کے برابر تھی۔

9 بج چکے تھے اور سب نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ بڑا مسئلہ کرنسی کا تھا اور میں سڑک کے دوسری طرف واقع ہوٹل پر چلا گیا جہاں انجم صاحب ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان سے کھانے پینے کے لئے دو ہزار دینار لئے جو سو سو دینار مالیت کے نوٹ تھے۔ باقی سب دوستوں نے بھی ان سے اتنی ہی تعداد میں کرنسی لی اور کسی نے بتایا کہ مزار کے سامنے ہوٹل پر ناشتہ اچھا ہے اور سستا بھی۔ ہم چاروں وہاں پہنچ گئے۔ ہوٹل کے باہر ایک شخص ہمارے قوالوں کی طرح ایک کان پر ہاتھ رکھ کر آوازیں لگا کر لوگوں کو کھانے کے لئے متوجہ کر رہا تھا۔ زبان چونکہ عربی تھی اس لئے ہم صرف اس کے سٹائل پر غور کرتے رہے۔ ہوٹل واجبی سا تھا ایک ٹیبل پر ہم لوگ بیٹھ گئے اور بیرے کو انگلیوں کے اشارے سے بتایا کہ ہم میں سے ہر ایک کے لئے دو کباب اور روٹیاں لے آؤ۔ کباب بنانے کا سٹائل پاکستانی تھا اور سیخ کباب ہمارے ہاں کے سائز کے تھے۔ روٹیوں میں نمک یہاں بھی زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ پانی کے جگ اور گلاس ہمارے ہاں کے ڈرائیور ہوٹل کی طرز کے تھے۔ سلاد کے طور پر ایک پلیٹ میں ایک پودے کے پتے تھے جس سے ہمارے ہاں چٹنی بنائی جاتی ہے۔ ہوٹل میں ماحول سے اندازہ ہوا کہ یہاں کے لوگ واقعی آداب سے ناواقف ہیں۔ پلاسٹک کے لمبے سائز کے ڈرم میں پانی رکھا

ہوا تھا اس میں سے ڈائریکٹ ہی جگ بھر کر بیرا میز پر لا کر رکھ دیتا تھا۔ ہمارے سامنے دو عمر رسیدہ عورتیں جنہوں نے کالی چادریں برقعہ کے طور پر اوڑھ رکھی تھیں کھانا کھانے کے لئے آ کر میز پر بیٹھ گئیں۔ ان کے لئے بیرا پانی کا جگ لے کر جا رہا تھا راستے میں اسے جگ زیادہ بھرا محسوس ہوا تو اس نے وہاں کھڑے ہو کر منہ سے لگایا اور کچھ پانی پی کر عورتوں کے میز پر رکھ دیا۔ دوسری طرف آٹا گوندھنے والا اپنی جگہ سے اٹھا اور پلاسٹک کے ڈرم میں ہاتھ ڈالا اور اس میں پڑے برتن میں پانی لیا اور پھر دوبارہ ڈرم میں پھینک دیا۔ ہم سب یہ دیکھ کر حیران ہوئے اور ہنستے بھی رہے۔

کھانے کے بعد بغیر دودھ چائے بھی پی اور کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے لکھ کر بتایا کہ بل 1800 دینار ہے۔ رقم دے کر باہر نکلے تو فقیروں نے ہمیں منٹوں میں ہوٹل پہنچا دیا۔ وہاں جلدی جلدی تیار ہوئے کیوں کہ 11 بجے ہمیں نئے ہوٹل میں شفٹ ہونا تھا جس کے لئے منتظمین گئے ہوئے تھے۔ ہم نے سامان وغیرہ باندھ کر ہوٹل چھوڑ دیا مگر منتظمین غائب تھے۔ خیر ہم سڑک کے کنارے سامان رکھ کر اِردگرد کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئے۔ سڑک ''ون وے'' تھی اور مغرب سے مشرق کو ٹریفک جا رہی تھی۔ دونوں طرف صراف حضرات کی دوکانیں تھیں جن میں سونے اور چاندی کے تیار زیورات وافر پڑے تھے مگر خریدار خال خال تھے۔ راشد، عارف اور بشیر بعض دکانوں سے زیورات خصوصاً انگوٹھیوں کی قیمتیں معلوم کرتے رہے۔ خرید اس لئے نہیں سکتے تھے کہ جیب میں دینار زیادہ نہیں تھے۔ اس دوران ایک اخبار بیچنے والا لڑکا آیا جس کے پاس عربی اخبار تھے اور انگریزی میں ''بغداد ٹائمز'' تھا۔ وہ میں نے لے لیا اس پر قیمت 5 دینار درج تھی میں نے راشد سے لے کر 25 دینار کا نوٹ دیا تو اس نے واپس کرتے ہوئے کہا کہ 100 دینار دو۔ ہمیں بڑی حیرت ہوئی کہ 5 دینار کے 100 مانگ رہا ہے! 100 دینار کا نوٹ اسے دیا تو وہ چلا گیا۔ اخبار کھول کر دیکھا تو اس کے صفحات صرف چار تھے اور ہمارے اخبار کے سائز کے دو ہی بنتے تھے۔ خبریں زیادہ تر انٹرنیشنل اور عراقی حکومت سے متعلقہ تھیں۔ سگریٹ نوشی کے اثرات اور کھیلوں وغیرہ پر فیچر

کے علاوہ مقامی ہوٹلوں اور آرٹ گیلریز کے پتہ جات اور ٹیلی فون نمبر بھی دیئے ہوئے تھے۔ کچھ دیر دیکھنے کے بعد اخبار میں نے بریف کیس میں رکھ لیا۔ جیسے جیسے وقت گذر رہا تھا خواتین وحضرات کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی کیوں کہ منتظمین کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ جب کہ سب کا سامان سڑک کے کنارے پڑا تھا۔

اس دوران ہم نے مرکزی بازار میں چکر لگا لیا وہاں دونوں جانب پرچون فروشوں کی پکی دکانوں کے درمیان ریڑھیوں والے چھوٹا موٹا سامان لے کر بیٹھے تھے۔ بازار کافی کھلا تھا اور اوپر سے ڈھکا ہوا تھا۔ رش بھی کافی تھا مگر خریداری زیادہ نہیں تھی۔ ہم ایک ریڑھی پر کھڑے ہو کر قلم دیکھنے لگے جو چائنا کے بنے ہوئے تھے۔ قیمت 50 روپے کے قریب تھی مگر معیاری نہیں تھے ہم نے واپس رکھے تو ریڑھی والا دام کم کر کے ہمیں دینے کے چکر میں تھا جس میں ہم نہ آئے اور آگے بڑھ گئے۔ دوکانوں پر عورتوں کے پہناوے، مردوں کے لمبے قمیض، عام استعمال کے جوتے، قالین، رومال اور روزمرہ کا دیگر سامان کافی مقدار میں پڑا تھا۔ بازار کے دوسری طرف لاہور کے ''بلال گنج'' کا سماں تھا۔ تھوڑا آگے آئے تو ہم ہوٹل والی سڑک پر تھے۔ پھلوں کی دو تین دکانوں پر انگور دیکھ کر ہم سے نہ رہا گیا اور موٹے انگور جو 200 دینار کے کلو تھے لفافہ میں ڈال کر پانی سے دھوئے اور چلتے ہوئے اپنے سامان کے پاس آ گئے جہاں دیگر احباب بیٹھے تھے۔ اس علاقہ میں بھی ایران کی طرز پر مکانات اور دفاتر کی چھت پر رکھ کر ایئر کولرز سے ٹھنڈی ہوا حاصل کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہیں سڑک پر دوپہر کے وقت ایک مرد اور عورت کے درمیان ''عربی لڑائی'' دیکھنے کا شرف بھی ہمیں حاصل ہوا۔ جن کے درمیان خاصی ''تو تو میں میں'' کے بعد عملی لڑائی شروع ہوگئی۔ عورت نے جوتی مارنے کے لئے کئی دفعہ لہرائی مگر آدمی نے اس سے قبل ہی عورت کے منہ پر تمانچہ رسید کیا جس سے وہ لڑکھڑا گئی۔ اب یہ پاکستان تو تھا نہیں کہ ہم مداخلت کرتے کہ عورت پر ہاتھ کیوں اٹھایا۔ دوسرا ہمیں جھگڑے کی اصل وجوہات کا علم بھی نہیں تھا۔ ایسے میں ہم سب تماشا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکے۔ ایک دو نوجوانوں نے لڑائی جہاں اور جیسے تھی ختم کرا دی۔ اتنے میں

ہماری بسیں بھی آ گئیں وہاں ڈیوٹی پر موجود ٹریفک سارجنٹ جس کی وردی بالکل پاکستان کی ٹریفک پولیس جیسی تھی کو ون وے سڑک پر بسیں کھڑی کرنے پر اعتراض تھا مگر یہ بتانے پر کہ ہم لوگ تھوڑی دیر میں جا رہے ہیں وہ مطمئن ہو گیا۔

ہماری بس بغداد کی کھلی شاہراہوں پر رواں دواں تھی ہم لوگ اشتیاق سے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لے رہے تھے اور حیران تھے یہ وہی بغداد ہے جس پر 1991ء میں اتحادیوں نے لاکھوں ٹن بارود برسایا مگر آج تباہی کا ایک بھی نشان نظر نہیں آ رہا۔ جدید طرز تعمیر کی حامل بلند و بالا عمارتیں اور ہوٹلز دیکھ کر تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم کسی ترقی یافتہ یورپی ملک میں پھر رہے ہیں۔ شہر کے ہر حصہ میں ٹریفک ضابطہ میں چل رہی تھی۔ سڑکوں کا خوبصورت جال بچھا ہوا تھا اور ''اے ون'' حالت میں تھیں۔ متعدد انڈر پاس اور فلائی اوور بنا کر ٹریفک کو رکاوٹوں سے پاک کیا گیا تھا۔ اس دوران ہم دریائے دجلہ کو عبور کرنے کے لئے ''شاہراہ جمہوریہ'' پر بنے طویل پل سے گذرے۔ پل پر سے دریائے دجلہ کا نظارہ بہت خوبصورت تھا۔ دریائے دجلہ کافی بڑا ہے اور پورے عراق کی معیشت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہوٹل کی لابی میں منتظمین حضرات ڈالرز کے بدلے عراقی بینک سے جو کرنسی دیناروں کی شکل میں لے کر آئے تھے تقسیم کر رہے تھے۔ عراقی دینار جو جنگ سے پہلے 3 ڈالر مالیت کا تھا اور قریباً 65 روپے پاکستانی کے برابر اب ایک ڈالر کے بینک سے 600 دینار اور بازار (بلیک) میں 2000 دینار ملتے تھے اور عراقی حکومت نے عراق میں آنے والے ہر غیر ملکی پر 5 ڈالر یومیہ خرچ کرنے کی پابندی لگا رکھی تھی۔ ہمارا وہاں 7 دن قیام تھا اور ہر ایک کو کم از کم 5 ڈالرز یومیہ اخراجات کے لئے 35 ڈالرز بینک سے دینار میں تبدیل کروانا تھے۔ ان 35 ڈالرز کی تبدیلی پر بینک کا 8 ڈالرز کمیشن بھی تھا یعنی کل 43 ڈالرز بنتے تھے۔ میں نے 50 ڈالرز کے بدلے 25500 دینار جو 100 اور 250 مالیت کے نوٹ تھے لئے اور فیصلہ کیا کہ یہی خرچ کروں گا۔

عراق جو کویت اور سعودی عرب کے بعد تیل پیدا کرنے والا بڑا ملک ہے کی حالیہ

اقتصادی بدحالی عراق ایران جنگ کے بعد کویت پر قبضہ سے ہونے والی امریکی بمباری اور تباہی کے ساتھ اقوام متحدہ کی طرف سے طویل عرصہ سے عائد اقتصادی پابندیوں کا نتیجہ ہے۔ یہاں چیزوں کی قیمتیں ہزاروں دینار میں ہیں۔ جنگ، تباہی اور اقتصادی پابندیوں سے قبل عراق میں ہمارے ہاں کے چھوٹے سکوں کی طرح ''فلس'' بھی گردش میں تھے اور آدھے دینار کے نوٹ سے لے کر پچیس، پچاس دینار کے نوٹ بھی زیر استعمال تھے مگر بین الاقوامی برادری سے رابطے ختم ہونے کے بعد یہاں صرف 100 دینار اور 250 دینار کے نوٹ کی تھوڑی بہت اہمیت ہے۔ پھر عراقی دینار کے نوٹ کا کاغذ بھی اتنا معیاری نہیں۔ پابندیوں کے باعث زیادہ تر ہوٹلز اور ٹریول ایجنسیز کے دفاتر بند پڑے تھے یا پھر کسمپرسی کی حالت میں تھے۔ جس ہوٹل میں ہم ٹھہرے اس کا کرایہ 13 ڈالرز یومیہ تھا جب کہ فائیو سٹار ہوٹلز ''الرشید'' فلسطین اور شیرٹن وغیرہ کا زیادہ سے زیادہ کرایہ 33 یا 34 ڈالرز تھا جو پاکستانی ایک ہزار روپے کے برابر تھا۔ حالانکہ پاکستان میں کسی بھی فائیو سٹار ہوٹل میں ایک ہزار روپے میں کمرہ ملنا ناممکن بات ہے۔ ہوٹل کے کمروں کے دروازے باہر نکل کر بند کرنے سے خود بخود ''لاک'' ہو جاتے تھے اور متعدد حضرات کی چابیاں غلطی سے اندر رہ گئیں اور باہر نکلنے پر دروازے ''لاک'' ہو گئے۔ استقبالیہ پر بتانے کے بعد متبادل چابیوں سے روم بوائز نے کمرے دوبارہ کھول کر دیئے۔

شام ہونے کو تھی اور بسیں مزار غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ (جسے مقامی لوگ اپنی زبان میں ''باب شیخ'' کہتے ہیں) جانے کے لئے تیار تھیں۔ نماز مغرب سے ذرا پہلے بس مزار کے باہر رکی اور سبھی حضرات بائیں جانب سے بڑے دروازے سے مزار کے احاطہ میں داخل ہوئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ نماز عشاء کے بعد 10 بجے ہوٹل واپسی ہوگی۔ مزار کے احاطہ میں زائرین اور فقیروں کا بہت رش تھا جن میں خواتین غالب اکثریت میں بچوں کے ہمراہ تھیں۔ مزار کے احاطہ میں داخل ہوتے ہی ادب واحترام کی ایک خاص روحانی کیفیت نے اپنی لپیٹ میں لیا اور حضور غوث اعظمؒ کے مزار انور پر حاضری کے لئے سب بے قرار ہو گئے۔ مگر اتفاق سے اس

وقت مزار کا دروازہ بند ہو چکا تھا کیوں کہ ہر اذان سے پانچ دس منٹ پہلے دروازہ بند کر کے خادم تالا لگا دیتے ہیں اور باجماعت نماز کی ادائیگی کے بعد دوبارہ کھولا جاتا ہے۔ ہم نے جوتے جمع کروائے اور وضو کے لئے دائیں جانب دروازہ سے باہر بنائی گئی عمارت میں پہنچے۔ خواتین وحضرات کے لئے طہارت اور وضو کا خاصا اہتمام تھا۔ اذان مغرب کی آواز بلند ہوئی اور خوش الحان مؤذن نے ایمان تازہ کر دیا۔ مزار غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے دائیں طرف خوبصورت اور وسیع چھت اور گنجائش والی مسجد میں باجماعت نماز ادا کی۔ مسجد کے امام شیخ محمد عبدالباقی محمد نجیب شیخ الحلقہ القادریہ سیدنا شیخ عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہیں بہت ہی دلآویز قرأت کرتے ہیں۔ نماز کے بعد ذکر کی محفل میں انہوں نے حلقہ میں خشوع وخضوع سے درود پاک اور صلوٰۃ وسلام کا ورد کروایا جو خاص عربی سٹائل میں بہت ایمان افروز تھا۔ اختتام پر امام صاحب سے سلام دعا اور تعارف ہوا۔ بڑی نفیس اور حلیم شخصیت ہیں اس کے فوراً بعد حضور غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دی۔ انتہائی برگزیدہ ہستی کے مزار انور پر حاضری بہت بڑی سعادت تھی۔ فاتحہ خوانی اور دعا میں اپنی طرف سے اور دیگر ان احباب جنہوں نے پاکستان سے چلتے وقت حاضری کا کہا تھا کی طرف سے سلام پیش کیا۔ مزار پر روشنیوں اور شیشہ کے کام کی تزئین وآرائش سے ماحول پُرکیف اور اُجلا اُجلا تھا۔ مقامی خواتین وحضرات بچوں کے ہمراہ قبر کی جالیوں سے لپٹ کر اور حسب روایت چار دفعہ طواف کر کے حاضری دے رہے تھے۔ عشاء کی اذان تک ہم وہیں رہے۔

غوث اعظمؒ سید عبدالقادر الگیلانی

مزار غورث اعظم رحمۃ اللہ علیہ جسے ''القادریہ'' بھی کہتے ہیں الروسفا کے علاقہ میں واقع ہے۔ تاریخی اعتبار سے مزار القادریہ دراصل ایک عظیم اسلامی درسگاہ تھی جسے حضرت امام حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد جید عالم اور باعمل شخصیت شیخ المبارک بن علی بن الحسین ابوسعید المکرّمی نے تعمیر کروایا تھا۔ ان کا انتقال 513 ہجری میں ہوا جس کے بعد ان کے مرید شیخ عبدالقادر بن موسیٰ بن عبداللہ الگیلانی رحمۃ اللہ علیہ جو وقت کے بہت بڑے امام تھے نے درسگاہ کا نظم و نسق سنبھالا اور اسے وسیع بھی کیا۔ آپ 470 ہجری کو بحیرۂ احمر کے جنوب میں واقع ضلع گیلان میں پیدا ہوئے۔ آپ نوعمری میں ہی بغداد آ گئے جہاں کے امراء وغرباء نے آپ کا بھرپور طریقے سے ساتھ دیا اور اظہارِ عقیدت کیا۔ آپ تیزی سے اسلامی علوم پر دسترس حاصل کرنے کے بعد درسگاہ میں ''مدرس اعلیٰ'' کی حیثیت سے پڑھاتے رہے۔ آپ نے بہت جلد اپنا وسیع حلقہ اثر پیدا کرلیا اور لوگوں کو دوسروں سے محبت واخوت اور اپنی ذات کی نفی کا درس دیا۔ آپ کی شہرت اور زیادہ پھیلی تو آپ کو غوث اعظم کہا جانے لگا اور آپ کی بے شمار کرامات ہیں۔ پوری اسلامی دنیا میں آپ کا نام انتہائی عقیدت واحترام کے ساتھ زندہ و جاوید ہے۔ مریدین اور طلباء آپ کے گرد حلقہ بند رہتے اور یہیں سے ''سلسلہ القادریہ'' وجود میں آیا اور آج یہ پوری دنیا میں پھیلے تصوف کے سلسلوں میں سب سے وسیع حلقہ رکھتا ہے۔

غوث اعظم شیخ عبدالقادر الگیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب والد اور والدہ دونوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے اور آپ حسنی حسینی سید کہلاتے ہیں۔ آپ کا آبائی رشتہ و تعلق حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم سے بھی ثابت ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے پوری زندگی درس و تدریس اور تبلیغ میں بسر کی اور

آپؒ کے درس کی مجلس میں روزانہ ہزاروں لوگ آپؒ کے علم وعرفان سے فیض یاب ہوتے تھے۔ آپ نے قرآن وسنت پر سختی سے عمل، اللہ پر بھروسہ اور مکمل اطاعت کی تبلیغ کی کیوں کہ آپؒ کے نزدیک یہی ایک مسلمان کی پہچان اور کامیابی کا واحد راستہ ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے 561 ہجری میں دارِفانی سے کوچ کیا اور آپ رحمۃ اللہ علیہ کو رات کے وقت مدرسہ کے احاطہ میں سپرد خاک کیا گیا اور اگلی صبح تک مدرسہ کے دروازے بند رکھے گئے۔ لوگ صبح ہوتے ہی یہ خبر سن کر آپؒ کے لئے فاتحہ پڑھنے کے لئے دوڑے چلے آئے۔ اس وقت سے یہ مدرسہ بغداد کی سب سے بڑی مسجد بن گیا۔ شیخ عبدالقادر الگیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اور مسجد کے گنبد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف مراحل میں تعمیر کئے گئے۔ 941 ہجری میں مسجد کے مرکزی حصہ پر عظیم الشان گنبد تعمیر کیا گیا جو اب تک عراق میں اینٹوں اور جپسم سے تعمیر ہونے والا واحد اور سب سے بڑا گنبد ہے۔ مزار غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ پر گھڑیال 1316 ہجری میں تعمیر کیا گیا اور یہ مینار بغداد میں پہلے سے بنے الکشکلا گھڑیال کے مشابہ ہے۔ 1970ء میں مزار کی تزئین وآرائش اور مرمت کے کام کا منصوبہ بنایا گیا جس کے دوران نیلے اور سفید گنبدوں کی تزئین کے علاوہ نئے گنبد بنائے گئے جن پر اسلامی طرز تعمیر اور نقاشی کے کام کا بہترین اہتمام کیا گیا جو اس سے پہلے عراق میں نہیں ہوا۔ صدر صدام حسین نے اس سلسلے میں خصوصی دلچسپی لی اور کام مکمل ہونے پر مزار پر حاضری دی اور کام کو تسلی بخش قرار دیا تھا۔

نماز عشاء کے لئے مسجد میں صف بندی ہوگئی اور ہم بھی پہلی قطاروں میں موجود تھے۔ نمازیوں سے کھچا کھچ بھری مسجد میں نماز کا اپنا ہی لطف تھا اور پھر امام صاحب کی قرأت سونے پہ سہاگہ تھی۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ امام حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے پیروکار ہونے کے ناطے نمازیوں کی اکثریت رفع یدین کرتی ہے۔ کیوں کہ خود غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ حنبلی تھے۔ نماز کے بعد مقامی لوگوں کا اپنے دائیں اور بائیں بیٹھے نمازیوں سے مصافحہ کرنے کا طریقہ بھی یہاں خوشگوار عمل تھا۔ عشاء کے بعد پھر ذکر کی محفل ہوئی اختتام پر امام صاحب نے دعا کروائی

اور ہم پھر مزار غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ میں جا بیٹھے۔ تا کہ وجد و کیف اور سرور و مستی میں روحانی ''اور ہالنگ'' ہوتی رہے۔ حتیٰ کہ مزار کا دروازہ بند کرنے کا وقت ہو گیا اور ہمیں اپنی بسوں میں ہوٹل پہنچنا تھا۔ تمام حضرات ہوٹل آئے تو رات کے کھانے کے لئے احباب ایک دوسرے سے دریافت کرتے رہے اور ہوٹل سے کچھ فاصلے پر واقع چھوٹی سی مگر صاف ستھری دکان پر پہنچے جہاں سیخ کباب اور روٹی دستیاب تھی۔ ساتھ میں ویٹر نے جب لسی کا ایک ایک گلاس لا کر میز پر رکھا تو ہمیں خوشگوار حیرت ہوئی کہ جہاں کی چائے میں دودھ نہیں ملتا وہاں ہمیں لسی دستیاب ہو گئی۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو بل 2200 دینار تھا یعنی فی کس دو کباب اور دو روٹی اور ایک گلاس لسی کے 1100 دینار تھے جو سرکاری ریٹ کے مطابق پاکستانی 60 روپے تھے۔ اس کھانے کے مہنگا مگر حسب منشاء ہونے کا تقابل کرتے ہوئے ہم ہوٹل پہنچے اور سو گئے۔

حسب سابق الصبح آنکھ کھلی اور نماز فجر کی ادائیگی کے بعد میں ہوٹل کی گیلری سے باہر کا نظارہ کرنے لگا کہ دیکھیں بغداد میں طلوع آفتاب کا منظر کیسا ہوتا ہے۔ دریائے دجلہ کے اوپر سے طلوع ہوتے سورج کا منظر بہت بھلا تھا کیوں کہ تا حد نظر سبزہ زار درخت تھے اور سامنے دو تین فائیو سٹار ہوٹلز کی خوبصورت عمارات پر سورج کی کرنیں پڑنے سے ان کا حسن نکھر کر سامنے آ رہا تھا۔

بغداد میں مزارات

نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ فون آنے شروع ہو گئے کہ آٹھ بجے تک لابی میں پہنچ جائیں تا کہ بروقت روانہ ہوسکیں۔ پروگرام کے مطابق آج ہمیں بغداد میں مدفون بزرگوں کے مزارات پر جانا تھا۔ صرف بغداد شہر میں 10982 بزرگانِ دین کے مزارات ہیں ان تمام پر جانا تو ممکن نہیں تھا مگر ہمارے منتظمین اور گائیڈ نے معروف بزرگان کے مزارات پر حاضری کا انتظام کیا تھا۔ ناشتہ کا بھی مسئلہ تھا اس لئے میں اور ارشد نیچے والے فلور پر بشیر اعوان اور عارف سعید کے پاس پہنچے۔ انہوں نے چائے اور آملیٹ منگوائے جس سے ہم اتنا کہہ سکتے تھے کہ ناشتہ کر چکے ہیں۔

نو بجے ہماری بسیں ہوٹل سے روانہ ہوگئیں اور مختلف شاہراہوں سے گذرتی ہوئیں بغداد ریلوے اسٹیشن کے بے آباد علاقہ میں رکیں تمام خواتین وحضرات نیچے اُتر آئے گائیڈ نے چار دیواری کا دروازہ کھلوایا۔

یہ حضرت الشیخ بہلول دانا الکوفی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار تھا۔ جو بغداد کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ آپؒ دریائے دجلہ کے کنارے مجذوب حالت میں بیٹھے رہتے تھے۔ ایک دن خلیفہ ہارون الرشید اپنی بیوی زبیدہ خاتون کے ہمراہ سیر کرتے ہوئے ادھر آ نکلے جہاں بہلول دانا بیٹھے دریا کی ریت سے گھروندے بنا رہے تھے۔

زبیدہ خاتون نے پاس آ کر پوچھا ''بہلول یہ کیا بناتے ہو؟''

انہوں نے کہا ''جنت میں گھر بناتا ہوں۔''

زبیدہ خاتون نے پوچھا ''کتنے کا بناتے ہو؟''

حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے ہی کچھ رقم بتا دی۔ زبیدہ خاتون نے رقم دے کر

کہا ایک گھر مجھے دے دو۔

حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے دو گھروندے بنائے ہوئے تھے رقم پکڑ کر کہا ''ایک تمہارا ہوا'' اور دوسرا گھروندا گرا دیا۔ اس سارے منظر کو دیکھ کر ہارون الرشید ناراض ہوئے مگر رات کو انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ زبیدہ خاتون کے ہمراہ جنت میں پہنچ گئے ہیں جہاں مرکزی دروازے سے فرشتوں نے ہارون الرشید کو واپس لوٹا دیا۔ خواب کے بعد ہارون الرشید کو گذشتہ روز کے واقعہ کا احساس ہوا اور فوراً وہ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور ریت کے گھروندے بنانے میں مگن حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا ''یہ گھر کتنے کا دو گے؟''

حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ نے زبیدہ خاتون کو بتائی گئی رقم سے دوگنی قیمت بتائی تو ہارون الرشید نے کہا ''کل تو آپؒ نے کم بتائی تھی''۔ جواب ملا کہ اس نے بغیر دیکھے خریدا تھا اور تم دیکھ کر خریدنے آئے ہو اس لئے قیمت زیادہ ہوگی۔

حضرت بہلول دانا رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مرتبہ کسی نے پوچھا دریائے دجلہ کے کناروں کو چھوڑ کر شہر میں کیوں نہیں آ جاتے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ''جب شہر میرے پاس آتا ہے تو میں وہاں کیوں جاؤں۔''

حضرت بہلول دانا رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کا دروازہ کھلنے سے یکدم اندر سے بھینی بھینی خوشبو پھوٹنے کا احساس ہوا۔ اس کے بعد مزار کے اندر کھڑے ہوئے یہ احساس نہیں ہوتا۔ مزار کے ساتھ ہی دائیں جانب کمرہ ہے جہاں گورونانک نے چلہ کاٹا تھا۔ وہاں ان کی مسہری اور چند دوسری چیزیں بھی ابھی تک پڑی ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ ایک سکھ یہاں خادم کی حیثیت سے رہتا تھا مگر کچھ عرصہ قبل وہ بھی چلا گیا۔

وہاں سے ہم پیدل ہی قبرستان میں تھوڑی دُور حضرت یوشع بن یون بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم کی قبر انور پر پہنچے۔ جس کے اوپر تعمیر شدہ عمارت خستہ حالت میں ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں ایک سانپ رہتا تھا اور مزار پر ہی خادم کے

ساتھ سوتا تھا۔ کچھ عرصہ قبل وہ خادم کے ساتھ سویا تھا کہ اسے کسی نے ہلاک کر دیا۔ سانپ کو بھی اسی احاطہ میں دفن کر دیا گیا۔ یہاں سے مشرق کی جانب چلتے ہوئے ہم ایک چار دیواری میں داخل ہوئے اندر کھجوروں کے کافی درخت تھے سامنے احاطہ میں دو مزارات تھے ایک السید ابی احمد بن الغربی ابن العزیز بن شیخ عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے عبدالعابد الی زینب جو امام علی نقی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں مدفون ہیں۔ یہاں سے چند قدم فاصلے پر بائیں جانب عمارت میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ماموں شیخ سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے مزارات ہیں۔ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور بزرگ گذرے ہیں جب کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق ایک واقعہ عام ہے کہ آپ شاہی پہلوان تھے۔ ایک سید جو افلاس کا شکار تھے نے بادشاہ کی توجہ حاصل کرنے کے لئے آپ سے کشتی لڑنے کا اعلان کیا۔ بادشاہ نے دنگل کی تاریخ مقرر کر دی اور کشتی شروع ہوئی جب جنید بغدادی اور مدمقابل سید نے پنجہ آزمائی شروع کی تو سید نے جنید کو کہا کہ وہ اس سے جسمانی طور پر کمزور ہے اور سید ہونے کے ناطے اپنی غربت دُور کرنے کے لئے بادشاہ سے سوال کرنا اس کی غیرت کو گوارا نہیں۔ آپؒ یہ سن کر داؤ پیچ لڑانے کے بعد اچانک خود ہی زمین پر گر گئے اور سید کو سینے پر بٹھا لیا لوگوں نے جنید کو طعنے دیئے کہ ایک شاہی پہلوان کمزور سے آدمی سے چت ہو گیا۔ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو رات خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہوئی اور ان کی بشارت سے آپ ولی کامل بن گئے۔

خواتین وحضرات ایک بار پھر بسوں میں سوار ہوئے اور پندرہ بیس منٹ کی مسافت پر ایک بڑے سے قبرستان کے سامنے جا کر سب اُترے یہاں سب سے پہلے حضرت معروف الکرخی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر گئے۔ آپؒ نے حضرت امام علی رضا رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اہل عرب آپ رحمۃ اللہ علیہ کا بہت احترام کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ آپؒ کے مزار پر مانگی گئیں دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ مزار میں تزئین اور آرائش خاصی تھی اور بائیں

جانب سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں جہاں پہلے چشمہ ہوا کرتا تھا آپ رحمۃ اللہ علیہ اس سے پانی پیتے اور وضو کرتے تھے۔

ہم نے نیچے جا کر چشمے کا پانی پیا جو ذائقے میں نمکین تھا۔ قبرستان میں قریب ہی حضرت شیخ معروف کرخی کے پیرومرشد حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے عمارت زیادہ بڑی نہیں ہے۔ آپؒ کا سلسلہ نسب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپؒ 163 ہجری میں فوت ہوئے۔

منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ

گرمی کافی تھی مگر دوبارہ ایئر کنڈیشنڈ بسوں میں بیٹھ کر اطمینان ہوا اور چکر کاٹ کر بسیں ایک آبادی میں رک گئیں۔ ہم نیچے اُترے تو یہ بغداد کا محلّہ الشیخ معروف تھا۔ غریبوں کی اس بستی میں پہلے زبیدہ خاتون جو خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی تھیں کے مزار پر گئے۔ تعمیر شدہ عمارت خاصی بلند ہے اور اُونچا گنبد فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث ویرانی نظر آئی یہاں ہمارے آگے پیچھے مانگنے والے بچے لگے رہے۔ پیدل ایک بازار سے ہوتے ہوئے عن الحق کہنے والے الشیخ حسین بن منصور الحلاج رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پہنچے۔ بازار میں دونوں اطراف گھروں سے خواتین اور بچے دروازوں سے لٹک کر ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی عمارت خوبصورت اور تزئین و آرائش کے اعتبار سے بہترین تھی۔ قبر پر سرخ گولڈن رنگ کی چادر ڈالی ہوئی تھی۔ مزار کا محل وقوع انارکلی لاہور میں قطب الدین ایبک کے مزار کی طرح ہے۔

منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کی موت بھی تاریخ اسلام کا ایک عبرتناک اور دل سوز واقعہ ہے۔ بغداد کے بادشاہ وقت نے علماء کے کہنے پر منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کو قید میں ڈال دیا۔ پھر اس کی موت کا حکم سنایا گیا۔

سب سے پہلے آپ رحمۃ اللہ علیہ کو قید خانہ سے نکال کر دُرّے مارے گئے۔ اس کے بعد آپ کو سولی پر چڑھانے کے لئے لے گئے۔ اس وقت تقریباً ایک لاکھ کا مجمع تھا۔ جب آپؒ کو سولی کے نیچے لے گئے تو آپؒ نے باب الطاق سے سولی کو بوسہ دیا۔ لوگوں نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کو پتھر مارے۔ حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لوگوں کی پیروی میں آپؒ کو ایک چھوٹا سا ڈھیلا مارا جس پر منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ نے آہ بھری۔

لوگوں نے پوچھا آپؒ کو اتنے پتھر مارے گئے مگر آپؒ نے اُف تک بھی نہیں کی اور شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک چھوٹے سے پتھر پر آہ کر رہے تھے۔

آپؒ نے فرمایا ''لوگ میری حقیقت سے آگاہ نہیں مگر شبلی رحمۃ اللہ علیہ تو میری حقیقت سے آگاہ ہیں اس لیے انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

بعدازاں دار کی سیڑھی پر آپ کے ہاتھ کاٹے گئے۔ تو آپ ہنسے اور لوگوں کو اپنے ہنسنے کا سبب بتاتے ہوئے کہا ''یہ ہاتھ کاٹنے آسان ہیں۔ ایسے جلاد آئیں جو ہماری صفات کے ہاتھ کاٹ کر دکھائیں۔'' اس کے بعد آپ رحمۃ اللہ علیہ کے دونوں پاؤں کاٹے گئے۔ تو پھر آپ رحمۃ اللہ علیہ مسکرائے اور فرمایا ''اگرچہ میں نے دنیا کا سفر ان پیروں سے کیا ہے لیکن ان کے علاوہ دوسرے قدم بھی رکھتا ہوں۔ جو اب بھی دونوں جہان کا سفر کر سکتے ہیں۔ اگر تم قدرت رکھتے ہو تو ان قدموں کو قطع کر کے دکھاؤ''۔

پھر دونوں خون آلود بازو منہ پر ملنے لگے۔ یہاں تک کہ کلائیاں اور چہرہ خون سے لتھڑ گیا۔ لوگوں نے پوچھا ''آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا کیوں کیا ہے؟''

آپؒ نے فرمایا: ''میرے جسم سے خون بہت نکل چکا ہے اور میرا خیال ہے میرا چہرہ زرد ہو گیا ہوگا اور شاید تم خیال کرو کہ یہ خوف کی وجہ سے ہو گیا ہے۔ اس لئے منہ پر خون مل رہا ہوں تا کہ تم کو سرخ رو نظر آؤں''۔ لوگوں نے پوچھا ''کلائیوں پر کیوں مل رہے ہیں''؟

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ''وضو کر رہا ہوں چونکہ منزل عشق میں دو رکعت ایسے ہیں کہ ان کا وضو خون سے درست ہوتا ہے۔''

بعدازاں آپ رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھیں نکالی گئیں تو لوگوں میں ایک حشر برپا ہو گیا۔ پھر آپ کی زبان نکالنی چاہی تو آپؒ نے فرمایا ''ذرا ٹھہر جاؤ، میں ایک بات کر لوں۔''

آپ رحمۃ اللہ علیہ کا آخری کلام یہ تھا ''حب الواحد، افراد الواحد، حب الواحد افراد الواحد''۔ یعنی یکتا کی دوستی یکتا کو۔ یکتائی سے یکتا کر کے دیکھتی ہے۔

اس کے بعد آپ رحمۃ اللہ علیہ کی زبان کاٹی گئی۔ عین مغرب کے وقت بادشاہ کا حکم آیا

کہ اس کا سرتن سے جدا کرو۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قہقہہ مارا۔ اس کے بعد آپ کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ دوسرے دن آپؒ کے تمام اعضاء اکٹھے کر کے جلا دیئے گئے اور خاک کو بھی دجلہ میں بہا دیا گیا۔ تو خاک بہنے کی بجائے دریا میں طغیانی لے آئی اور آواز اناالحق بدستور جاری رہی۔ جب طغیانی نے زور کیا اور شہر کو خطرہ لاحق ہوا تو شہر میں شور مچ گیا۔

حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید خاص گوشہ نشین تھا جس کو آپؒ نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ جب میری خاک دجلہ میں ڈالی جائے گی تو اس میں طغیانی آ جائے گی۔ اس وقت میرا چوغہ لیکر جانا اور دریا میں خاک پر ڈال دینا جس سے آواز اناالحق بھی بند ہو جائے گی اور طغیانی بھی تھم جائے گی۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو شہر تباہ ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو ناحق تکلیف ہوگی جو میری زندگی کا مقصد نہیں۔ جب شور اس مرید خاص کے کانوں تک پہنچا تو وہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کا چوغہ لے کر دریا کی طرف بھاگا اور وہاں جا کر چوغہ خاک پر ڈال دیا۔ آواز اناالحق بند ہوگئی اور دریا کا پانی اترنا شروع ہو گیا۔ لوگوں نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی خاک کو اکٹھا کر کے دریا سے نکال لیا تا کہ اسے دفن کر کے آپؒ کی قبر بنائی جائے۔

یہاں سے واپسی پر بھی مانگنے والے بچے ہمارا پیچھا کرتے رہے۔ انہیں کسی نے رقم دینے کی کوشش کی تو وہ پریشان ہو گیا کیوں کہ بچوں کی تعداد کافی تھی۔

بعدازاں الشیخ حبیب العجمی داعی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر آئے جس کے احاطہ میں مسجد بھی ہے۔ مسجد اور مزار خستہ حالت میں تھے اور پلستر بوسیدہ ہو کر دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ یہاں اِردگرد کے گھروں میں کھجور کے درخت پھل سے لدے ہوئے تھے۔ یہاں سے حاضری کے بعد السید البشر الحافی اور حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہما کا مزار قبرستان کے مرکز میں واقع ہے پر فاتحہ خوانی کے لئے پہنچے۔ یہ مزارات حضرت امام اعظم حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب ہی ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ

جہاں اس وقت حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مزار واقع ہے عباسی دور میں بغداد کا سب سے مشہور حصہ شمار کیا جاتا تھا۔ یہاں واقع قبرستان کو ''الخضر اں قبرستان'' کہا جاتا ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کو بغداد میں ''امام اعظم'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

آپؒ کا پورا نام ابوحنیفہ النعمان بن ثابت الکوفی ہے اور آپؒ 699ء (80 ہجری) کو کوفہ میں پیدا ہوئے۔ آپؒ نے حصول علم کے لئے کوفہ کے معروف عالم دین حماد رضی اللہ عنہ کی شاگردی اختیار کی جبکہ حدیث حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے پڑھی۔ اس کے ساتھ گذر بسر کے لئے آپؒ ایک خاص قسم کا کپڑا تیار کرتے اور اس کی تجارت کرتے تھے۔ غیر معمولی ذہانت اور محنت کے ساتھ استاد کی بھرپور توجہ کے نتیجہ میں آپؒ نے بلند علمی مرتبہ حاصل کرلیا اور اپنے استاد حضرت حماد رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد آپؒ کوفہ میں علم وفضل کے اعتبار سے واحد مفتی تھے۔ حصول علم حدیث کے لئے آپؒ مکہ مکرمہ مدینہ بھی گئے۔ مکہ میں آپؒ نے حضرت عطاء بن ابی رباحؒ سے احادیث کا علم حاصل کیا۔ آپؒ کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت سے متاثر ہوکر استاد آپ کو اپنے برابر بٹھانے لگے اور آپؒ اکثر مکہ اور مدینہ میں ہزاروں افراد کو درس حدیث دیتے رہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے مسلمانوں میں حنفی مکتبہ فکر کی بنیاد رکھی اور اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ مسلمان اسی مسلک کی پیروی ہیں۔ اسلامی فقہ وحدیث کے چاروں اماموں میں سے حضرت امام ابوحنیفہؒ کو بلند مرتبہ حاصل ہے۔ آپؒ نے سب سے پہلے اسلامی قوانین کی تشریح اور وضاحت بیان کی۔ عباسی خلیفہ منصور نے امام اعظمؒ کو قاضی کا عہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا اور آپؒ کے انکار کی صورت میں اس نے آپؒ کو زندان میں ڈال دیا لیکن آپؒ اپنے فیصلہ پر ڈٹے رہے۔ قید خانے میں ہی 767ء (150 ہجری) کو

آپؒ کے کھانے میں زہر ملا دیا گیا۔ زہر کے اثر کا علم آپؒ کو موت سے قبل ہو گیا اور آپؒ نے اپنے رب کے حضور سجدہ ادا کیا اور آپؒ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ جس قبرستان میں آپؒ کو دفن کیا گیا وہ اب ضلع ابوحنیفہ اور الاعظمیہ کہلاتا ہے۔ آپؒ کے مزار کا احاطہ کافی بڑا ہے۔ مزار اور اس سے ملحقہ مسجد کی عمارت اسلامی طرز تعمیر کا عالی شان نمونہ ہے۔ مزار اور مسجد کے شمال مشرق میں بڑی سڑک گذرتی ہے جب کہ جنوب مغرب میں قبرستان پھیلا ہوا ہے۔ امام اعظمؒ کے مزار کے گنبد پر بہت خوبصورت نقاشی نظر آتی ہے۔ سلجوکی سلطان علب ارسلان کے دور 1067ء (459ھ) میں امام اعظمؒ کے مزار کی وسیع پیمانے پر تعمیر و مرمت اور تزئین و آرائش الملک ابوسعید الخوارزمی نے کروائی اور ایک بہت بڑا گنبد بھی تعمیر کروایا تھا۔ موجودہ مسجد کا گنبد 1638ء (1048ھ) میں تعمیر کیا گیا۔ مزار امام اعظم سے ملحقہ مسجد 1871ء (1288ھ) میں تعمیر کی گئی اور 1903ء (1321ھ) میں اس کی نئے سرے سے تعمیر و مرمت ہوئی جب کہ مرکزی دروازہ 1948ء (1367ھ) میں بنایا گیا تھا۔ مزار کے احاطہ میں شمال مشرقی جانب کونے میں ایک مینار ہے جس پر چاروں جانب بڑی بڑی گھڑیاں لگی ہوئی ہیں۔ اسے مرحوم عبدالرزاق مصاحب الاعظمی نے 1958ء میں بنوایا تھا۔ وضو اور پینے کے لئے ٹھنڈے پانی کا الیکٹرک کولرز کے ذریعے انتظام کیا گیا ہے۔ مسجد کے اندر خوبصورت قالین بچھائے گئے ہیں اور ہم نے یہاں نماز ادا کی۔ سامنے دیوار پر غلاف کعبہ کا بہت بڑا ٹکڑا جس پر قرآن کریم کی آیات کی کڑھائی کی گئی ہے شیشہ میں محفوظ کر کے آویزاں کیا گیا ہے۔ مسجد کے خادم نے ہمیں غلاف کعبہ کی زیارت کروائی۔ یہاں سے فارغ ہو کر امام اعظمؒ کے مزار میں داخل ہوئے تو اندرونی در و دیوار بقعہ نور بنے ہوئے تھے۔ پرشکوہ عمارت میں امام اعظمؒ کے دربار میں ہر کوئی باادب اور خاموش بیٹھا امام اعظمؒ کے بلند مرتبہ اور عظمت کو یاد کر رہا تھا۔ مزار کی اندرونی دیواروں پر شیشے کا بہترین کام ہوا ہے اور متعدد فانوس روشن تھے۔ فاتحہ خوانی اور حاضری کی قبولیت کی دعا کے ساتھ جیسے ہی باہر آئے۔ مزار پر متعین سرکاری خادمین نے بخشیش کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ اکثر حضرات

نے انہیں دینار دیئے۔ ایک خاص بات جو امام اعظمؒ کے مزار پر دیکھ کر حیرت ہوئی وہ دیگر مزارات کی طرح مقامی زائرین کی عدم موجودگی تھی کیوں کہ ہم نے دو مرتبہ یہاں حاضری دی مگر کوئی رونق نہیں تھی۔ حالانکہ بغداد میں تمام برگزیدہ ہستیوں کے مزارات خصوصاً غوث اعظمؒ اور امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کے مزار پر ہر وقت خواتین وحضرات کی ایک بڑی تعداد موجود رہتی ہے۔ امام اعظمؒ غوث اعظمؒ کے دور سے بہت پہلے ہوئے ہیں اور اپنے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کے اعتبار سے مستند مقام رکھتے ہیں مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ بغداد میں زیارات کے لئے جانے والے حضرات ان کے مزار پر جانے کی زحمت کم ہی گوارا کرتے ہیں اور مقامی لوگوں کے بارے میں یوں لگتا ہے جیسے وہ انہیں بھلا چکے ہیں۔ ایک محترم بزرگ نے بتایا کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب امام اعظمؒ کا مزار اور اس کا احاطہ ہمیشہ پر رونق رہتا تھا اور دن رات مساکین کے لئے لنگر جاری رہتا تھا۔ مگر اب جمعۃ المبارک کے اجتماع کے علاوہ اکثر یہاں ''ہو'' کا عالم نظر آتا ہے۔ 2003ء میں بغداد پر اندھا دھند امریکی بمباری سے یہاں مسجد کے میناروں کو خاصا نقصان پہنچا تھا کیوں کہ امریکیوں کا کہنا تھا کہ مزاحمت کار عراقی فوجی یہاں چھپے ہوئے کارروائی کرتے تھے۔

امام اعظمؒ کے مزار سے تھوڑی دور شمال میں آبادی کے درمیان حضرت خواجہ معروف الکرخیؒ کے خلیفہ اور حضرت جنید بغدادیؒ کے ہمعصر ابوالحسن نوریؒ کا مزار ہے جو کافی قدیم ہے اور مزار کے چھوٹے سے گنبد میں دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ قبر سادہ ہے اور اس کے اوپر سبز چادر بچھی ہوئی تھی۔ ملحقہ حویلی میں اور بھی کمرے ہیں جن میں لائبریری وغیرہ بھی ہے۔ فاتحہ خوانی کے بعد یہاں سے چلے تو ہماری بسیں جس جگہ رکیں وہاں اردگرد ورکشاپس اور مستریوں کی دکانیں تھیں یوں لگتا تھا جیسے ہم بلال گنج لاہور آ گئے ہوں۔ یہاں سلسلہ سہروردیہ کے بانی شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کا مزار ہے۔ ہمارے مقامی گائیڈ نے مزار کے متولی کو بلوایا جس نے مرکزی دروازے کا تالا کھولا۔ تعمیر شدہ عمارت کے سامنے کھلی حویلی ہے جس کے درمیان میں کھجور کے چند درخت ہیں۔ پکی ہوئی کھجوریں زمین پر گری ہوئی تھیں جنہیں احباب نے فرداً

فرداً اکٹھا کر کے کھایا۔ عمارت کے اندر پہلے مسجد ہے اور اس کے ساتھ مزار ہے۔ چھوٹے سائز کی قبر پر سبز چادر ڈالی ہوئی تھی۔ قبر کے گرد لکڑی کا جنگلا ہے جس کی چھت نہیں اور شمالاً جنوباً دو سبز پرچم لگے ہوئے تھے۔ مزار کے اندر ہی شمال میں معتصم بلا کی قبر ہے۔ جو گمنام اور ویران ہے مگر اس کے اوپر سبز رنگ کا کپڑا ڈالا ہوا تھا۔ اس عباسی خلیفہ کے متعلق ہمیں بتایا گیا کہ اس نے ''اہل بیت'' پر بہت ظلم اور سختیاں کی تھیں اور اب یہ قبر مقام عبرت ہے۔ نماز عصر ہم نے باجماعت یہیں مسجد میں ادا کی۔ باہر نکلے تو مقامی بچے مانگنے کے لئے ہمارے اردگرد جمع ہو گئے مگر سب نے جلدی جلدی بسوں میں سوار ہو کر ان سے جان چھڑالی۔ اب ہماری بسیں جس جگہ رک رہی تھیں وہاں اِردگرد لکڑی کے ٹال تھے اور نیچے اُترے تو ہمیں بتایا گیا کہ وہ سامنے حضرت امام غزالیؒ کا مزار ہے۔ یہ وہی امام غزالی ہیں جن کا ذکر علامہ اقبالؒ نے

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی

کہہ کر کیا ہے۔ چھوٹی چاردیواری کے اندر پہلے برآمدہ ہے اور پھر چھوٹے سے کمرہ میں امام غزالیؒ آسودہ خاک ہیں۔ قبر کے اِردگرد ڈیڑھ فٹ اونچی لکڑی کی باؤنڈری ہے اور لکڑی ہی کی سریک ہے جس کے اوپر سبز اور سنہری رنگ کی چادر ڈالی گئی ہے۔ مزار کا ماحول اور حالت اس امام کی عظمت اور خدمات کے ہرگز شایانِ شان نہیں۔ ہم نے فاتحہ خوانی کی اور باہر احاطہ میں ایک مقامی عورت جس نے بچہ اٹھا رکھا تھا ہمارے وفد میں شامل خواتین سے اُردو میں گفتگو کر رہی تھی۔ اس کا تعلق پاکستان سے تھا مگر اس کی شادی عراق میں ہوئی اور اس کا خاندان یہاں آ گیا وہ اسی محلّہ میں رہتی تھی جب کہ اس کے والدین غوث اعظمؒ کے محلّہ باب شیخ میں رہتے تھے۔ دیگر تمام حضرات کو بھی عورت نے سلام کیا تو سب کو بڑی خوشگوار حیرت ہوئی اور عورت کو بطور امداد ہر ایک نے کم از کم 100 دینار دیئے جو جمع ہو کر خاصے بن گئے۔ یہ عورت ہماری ہم سفر بن گئی کیوں کہ ہم نماز مغرب اور عشاء کے لئے مزار غوث اعظمؒ سے ملحقہ مسجد جا رہے تھے۔

پرشکوہ قرآن گیلری

نماز مغرب میں ابھی کچھ وقت باقی تھا جب ہم ''باب شیخ'' پہنچے۔ غوث اعظمؒ کے مزار پر حاضری کے بعد میں اور راشد مسجد کے بالکل سامنے بالائی منزل پر واقع لائبریری میں چلے گئے۔ ہم چونکہ پہلی مرتبہ لائبریری میں آئے تھے اس لئے اتنی بڑی لائبریری دیکھ کر ہماری دلچسپی بڑھ گئی۔ لائبریری میں ایک لاکھ سے زائد کتب ہیں جنہیں سلیقے سے الماریوں میں ترتیب کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ دروازے کے بائیں جانب ''قرآن گیلری'' ہے جو واقعی ایک نادر خزانہ ہے۔ بے شمار زبانوں میں تراجم پر مبنی قرآن کریم کے نسخے مختلف سائز میں محفوظ کئے گئے ہیں جنہیں دیکھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ سونے کے پانی سے لکھا ہوا قرآن کریم کا نسخہ بھی موجود ہے جب کہ داراشکوہ کا قلمی نسخہ بھی شیشے کے ایک بکس میں محفوظ ہے۔ یہاں پر ریڈنگ ٹیبل پر چند ایک نوجوان خاموشی سے محو مطالعہ تھے۔ میں ابھی قرآن گیلری میں ہی کھڑا تھا کہ ایک عراقی نوجوان میرے قریب آ کھڑا ہوا۔ میں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا ''السلام علیکم''، ''وعلیکم السلام'' کے بعد ہم نے ہاتھ ملایا تو تعارف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس نے اپنا نام کاظم حسن بتایا اور وہ انجینئرنگ کا طالب علم تھا۔ کاظم حسن ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتا اور اسی طرح سمجھ بھی رہا تھا اس لئے بات چیت کا زیادہ مزہ نہیں آیا۔ بہرحال اس نے پوچھا کہ آپ کو عربی کیوں نہیں آتی؟ میں نے کہا ''ہم سکول میں عربی پڑھتے ہی نہیں''۔ اس نے پوچھا ''آپ لوگ قرآن کریم کس زبان میں پڑھتے ہیں؟'' ''وہ تو عربی میں پڑھتے ہیں'' میں نے جواب دیا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اب ہمارے سکولز میں حکومت نے عربی کی تعلیم کا انتظام کر دیا ہے جس سے پاکستان میں عربی بول چال کو فروغ ملے گا۔ میں نے کاظم حسن کو پاکستان آنے کی دعوت دی تو اس نے کہا کہ وہ حالات بہتر ہونے پر

ضرور پاکستان آئے گا۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کے ایڈریس لئے اور میں نے اس سے اجازت چاہی کیوں کہ نماز کا وقت ہوگیا تھا۔ ذکروفکر کی محافل میں شرکت اور نماز عشاء کے بعد پروگرام کے مطابق رات دس بجے ہم واپس ہوٹل آ گئے۔

صبح پروگرام کے مطابق 9 بجے ہم بغداد سے 30 کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع شہر مدائن جو اب ''سلمان پاک'' کہلاتا ہے روانہ ہوئے۔ یہاں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ صحابی رسول ﷺ کا مزار انور ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

آپ رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ اندلس میں پیدا ہوئے۔ اصل آپ رضی اللہ عنہ کی فارس ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے والد آتش پرست تھے۔ پہلے آپ رضی اللہ عنہ دین مجوسی سے بیزار ہو کر دین موسیٰ علیہ السلام میں داخل ہوئے۔ بعدازاں دین نصاریٰ اختیار کیا اور شام و روم میں راہبان نصاریٰ کی خدمت میں رہے۔ تقریباً دس مرتبہ نوعیت بہ نوعیت فروخت ہوئے۔ آخری راہب جس کے پاس آپ رضی اللہ عنہ تھے جب وہ مرنے لگا تو اس نے آپ رضی اللہ عنہ کو بشارت دی کہ مدینہ میں پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا زمانہ قریب آ گیا ہے تم ان کا دین اختیار کرنا۔

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو ہجرت کے پہلے ہی سال دین اسلام اختیار کیا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پر بیعت کی اور ہجرت کے پانچویں سال میں جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مضاربت کا سونا دلوا کر بنو قریضہ کے یہودی عثمان بن سہل کی غلامی سے آزاد فرمایا۔ اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنے لگے۔

ایک روایت کے مطابق آپ رضی اللہ عنہ ایک یہودی کے غلام تھے اور آزادی کا کوئی سلسلہ نہیں بن رہا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ تڑپ رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام بن جاؤں۔ کسی نے آپ رضی اللہ عنہ کی تڑپ کی اطلاع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی سے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی آزادی کی قیمت پوچھی تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے یہودی آقا نے کہا کہ سینکڑوں کھجوروں کا باغ لگایا جائے، ان درختوں پر پھل آئے اور میں کھاؤں تو اسے آزاد کر دوں گا۔ یہ کڑی اور بظاہر ناممکن شرط سن کر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ پریشان ہو گئے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت جوش میں آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو تسلی دی کہ آپ

بہت جلد رہائی مل جائے گی۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اکٹھا کیا اور کہا کہ کھجوروں کی گٹھلیاں بوئیں، حضرت بلال رضی اللہ عنہ پانی لگانے والے تھے۔ آنحضور ﷺ نے یہودی کو پیغام بھیجا کہ وہ کل کھجوروں کے باغ میں آ کر تیار پھل کھالے۔ دوسرے دن کھجوروں کی بہاریں لگی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر نہ صرف حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو رہائی نصیب ہوئی بلکہ ان کا یہودی آقا خود حضور ﷺ کا غلام ہو گیا۔

آپ نجبائے صحابہ کرام اور اصحاب صفہ میں سے ہیں۔ تمام اُمت اس بات پر متفق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے خاص اصحاب اہل صفہ تھے جن کی بود و باش ہمیشہ مسجد نبوی میں تھی اور ہمیشہ ذکر الٰہی میں مصروف رہتے تھے اور دنیا سے بالکل قطع تعلق کئے ہوئے تھے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فضائل پر رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ کا اصحاب صفہ پر گزر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ دیکھ کر کہ اصحاب صفہ اپنے فقر و مجاہدہ کے باوجود خوش و خرم ہیں کہ تمہیں اور تمہاری اتباع کرنے والے تمام موجود و آئندہ لوگوں کو خوشخبری ہو کہ وہ سب میرے رفیق جنت ہوں گے اور وہ اللہ کے برگزیدہ اور پسندیدہ لوگ ہیں۔

آپ رضی اللہ عنہ ان چار صحابیوں میں سے ہیں جن کو اللہ دوست رکھتا ہے۔ ان تین صحابیوں میں سے ہیں جن کی جنت مشتاق ہے اور ان چار بزرگوں میں سے ہیں جن کی نسبت حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت وصیت کی کہ ان کے پاس علم تلاش کرو۔

آپ رضی اللہ عنہ غزوۂ خندق اور غزوات مابعدہ میں شامل ہوئے۔ غزوۂ احزاب میں جب خندق کھودنے لگے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خندق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں تقسیم فرما دی تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے متعلق مہاجرین و انصار میں اختلاف پیدا ہوا کہ ہر ایک فریق کا دعویٰ تھا کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ہم سے ہیں اس وقت رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((سلمان من اهل البيت)).

''سلمان رضی اللہ عنہ میرے اہل بیت رضی اللہ عنہم سے ہیں۔''

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ عنہ کو اپنے ایام خلافت میں حاکم مدائن مقرر فرمایا اور پانچ ہزار درہم سالانہ آپ رضی اللہ عنہ کو وظیفہ ملتا تھا وہ آپ اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے تھے اور بوریا بافی سے اپنا گزارا فرماتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا کوئی گھر نہیں تھا درختوں اور دیواروں کے سایہ میں رہا کرتے تھے۔ ایک شخص نے عرض کیا آپ رضی اللہ عنہ کے رہنے کے لئے گھر بنا دیتا ہوں۔ فرمایا مجھے گھر کی ضرورت نہیں۔ اس نے اصرار کیا اور کہا کہ جس قسم کا گھر آپ رضی اللہ عنہ کی طبیعت کے موافق ہے وہ مجھے معلوم ہے۔ فرمایا بیان کر۔ اس نے عرض کیا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے لئے ایسا گھر بنا دیتا ہوں کہ جب آپ کھڑے ہوں تو سر مبارک اس کی چھت سے لگے اور جب پاؤں پھیلائیں تو پاؤں کی انگلیاں دیوار سے جا لگیں۔ فرمایا درست ہے چنانچہ اس نے ایسا ہی گھر تیار کر دیا۔

آپ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک دھاری دار کمبل تھا جس کا کچھ حصہ آپ رضی اللہ عنہ اوڑھ لیتے تھے اور کچھ نیچے بچھا لیتے تھے۔ گورنری کے زمانہ میں بھی یہی کمبل آپ رضی اللہ عنہ کے پاس رہتا تھا۔ بعض ناواقف لوگ آپ رضی اللہ عنہ کی ظاہری صورت دیکھ کر آپ رضی اللہ عنہ سے بطور مزدور اپنا اسباب اٹھواتے چنانچہ ایک مرتبہ اپنے ایام حکومت میں آپ رضی اللہ عنہ شہر مدائن کے بازار میں جا رہے تھے اور کسی شخص کو اپنا اسباب لے جانے کے واسطے مزدور کی تلاش تھی۔ جب آپ رضی اللہ عنہ کو کمبل اوڑھے ہوئے دیکھا تو آپ رضی اللہ عنہ کو مزدور سمجھ کر آپؓ پر اسباب رکھ کر چل دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں فرمایا ''میں گورنر ہوں''۔ راستہ میں ایک شخص ملا اور کہا اے امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ آپ نے یہ بوجھ کیوں اٹھا رکھا ہے۔ تب اس شخص کو معلوم ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ امیر شہر ہیں۔ اس نے اپنا سر آپ رضی اللہ عنہ کے قدموں پر رکھ دیا اور معذرت چاہی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو نے اپنے گھر تک لے جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اب وہاں پہنچا کر ہی واپس ہوں گا۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جب اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو اپنی بیوی سے کہا کہ کچھ کستوری جو تمہارے پاس ہے اسے پانی میں گھول کر میرے سر کے گرد چھڑک دو چونکہ اب ایک قوم آنے والی ہے جو نہ انسان ہیں نہ جن۔ آپ کی بیوی کا بیان ہے کہ میں آپ رضی اللہ عنہ کا

ارشاد بجالائی اور گھر سے باہر نکل گئی۔ آواز آئی السلام علیکم یا ولی اللہ، السلام علیک یا صاحب رسول اللہ ﷺ! جب میں اندر آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ آپ رضی اللہ عنہ کی روح مبارک پرواز کر گئی ہے اور آپ رضی اللہ عنہ ایسے لیٹے ہوئے ہیں گویا سو رہے ہیں۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مزار کی عمارت کافی وسیع ہے اور بہت بڑا گنبد ہے۔ اِردگرد بے شمار کمرے بنے ہوئے ہیں۔ مزار کی مرکزی عمارت میں ازسرنو تزئین و آرائش کا کام ہو رہا تھا جب کہ دائیں جانب کمروں کی قطار تھی جن کے برآمدوں میں فقیر براجمان تھے۔ ملحقہ مسجد بہت خوبصورت ہے جس کا مینار خاصا بلند ہے۔ تعمیر و مرمت کی وجہ سے مزار کے اندر صفائی کا خاطر خواہ انتظام نہیں تھا مگر ہم سب وہاں بیٹھے، فاتحہ خوانی اور دعا ہوئی جس کے بعد مقامی طور پر خریدے گئے انگور بطور تبرک تقسیم کئے گئے۔ کچھ مقامی خواتین اور بچے بھی ہمارے درمیان موجود رہے۔ قبر بالکل سادہ ہے جس پر سبز رنگ کی چادر ڈالی ہوئی تھی۔ مزار کے بائیں جانب خستہ حال چھت کے نیچے چند قبریں ہیں۔ ایک گنبد کے نیچے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے گنبد کے نیچے حضرت عبداللہ بن جابر انصاری اور امام طاہر بن زین العابدین رضی اللہ عنہما کی قبریں ہیں جن پر سبز رنگ کی چادریں پڑی ہیں۔

وہاں بھی فاتحہ خوانی کرنے کے بعد ہم واپس ہوئے اور باہر سڑک پر آ کر ہم نے ایک کھوکھا نما دکان سے ایک بال پوائنٹ خریدنے کی کوشش کی مگر قیمت نے ہمیں امر سے باز رکھا کیوں کہ دکاندار اس کے بارہ روپے پاکستانی کے برابر دینار مانگ رہا تھا۔ کچھ دوستوں نے سستے اور اچھے دیکھ کر وہاں سے انگور خرید لئے اور بسوں میں بیٹھ کر ہم دس منٹ بعد پھر اتر آئے۔ سامنے برلب سڑک ساسانی بادشاہوں کے پرشکوہ محلات کے کھنڈرات تھے جو اپنی بناوٹ اور بلندی کے اعتبار سے اب بھی حیران کر دینے والے تھے۔ یہاں ہم نے تصاویر بنائیں اور واپسی کے لئے بس میں بیٹھنے لگے تو پتہ چلا کہ ایک بس کا ایئر کنڈیشننگ سسٹم خراب ہو گیا ہے۔ گرمی بھی کافی تھی اور ایئر کنڈیشننگ کے بغیر بند شیشوں والی بس میں سوار ہونا ''تندور'' میں بیٹھنے کے مترادف تھا۔ مجبوراً دونوں بسوں کے مسافر ایک میں جیسے تیسے سوار

ہو گئے اور جمعۃ المبارک کی ادائیگی کے لئے پروگرام کے مطابق مزار غوث اعظمؒ سے ملحقہ مسجد پہنچ گئے۔ جماعت کھڑی ہونے میں کچھ ہی وقت باقی تھا اور ہمیں وضو کے بعد مسجد میں رش کی وجہ سے ہمیں جگہ نہیں مل رہی تھی۔ بالآخر مزار غوث اعظمؒ کے مرکزی دروازہ کے عین سامنے جگہ مل گئی۔ امام صاحب نے عربی میں تقریر اور خطبہ دیا پھر جماعت کے ساتھ دو فرض ہم نے ادا کئے اور اسی جگہ باقی سنتیں اور نفل ادا کرنے میں لگ گئے۔ ہم ابھی مصروف ہی تھے کہ ہمارے اِردگرد ہجوم اکٹھا ہونا شروع ہو گیا جو مزار غوث اعظمؒ کے مرکزی دروازہ جو اندر سے بند تھا کے سامنے بلند آواز میں ''لا الہ الا اللہ'' کا ورد کر رہا تھا۔ یہ زیادہ تر مقامی مسلمان تھے جو اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی دروازہ کی طرف اٹھا کر زیادہ زور سے کلمہ طیبہ کے پہلے حصہ کا ورد جاری رکھے ہوئے تھے۔ جلدی میں ہم بھی کھڑے ہو گئے اور حیران بھی کہ اب کیا ہونے والا ہے؟ جب ورد اپنے عروج کو پہنچ گیا تو اچانک سامنے مزار کا دروازہ کھل گیا اور تمام عقیدت مند مزار میں داخل ہونے کے لئے زور آزمائی میں لگ گئے اور اسی سٹائل میں ہم بھی اندر داخل ہو گئے۔ اندر موجود خادم بڑی مستعدی سے جگہ خالی کروانے کے لئے زیارت کے بعد حضرات کو دوسرے دروازہ سے باہر بھیج رہے تھے۔

یہ سلسلہ گھنٹہ بھر جاری رہا اور خاصا روح پرور منظر تھا۔ ہم مزار کے اندر ہی موجود رہے اور اطمینان سے فاتحہ خوانی کے بعد باہر مسجد میں آ گئے۔ بھوک ستا رہی تھی میں نے راشد سے پوچھا تو اس کا بھی یہی حال تھا۔ دونوں بازار کی طرف کھانے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ جمعہ کو چھٹی کی وجہ سے بازار بند تھا اور اِکا دُکا دکانیں کھلی تھیں اور بند دکانوں کے باہر چھوٹی موٹی اشیاء کی عارضی دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ کہیں کھانے کی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ تلاش میں ہم بھی چلتے گئے اور تقریباً آدھ گھنٹے بعد کافی دُور آ کر ایک بند مارکیٹ کے برآمدہ میں ایک آدمی کباب لگا رہا تھا۔ اس سے پوچھا ''کم فی؟'' (کیا قیمت ہے) اس نے 3 پنج اور ساتھ دینار کا نوٹ اُٹھا کر بتایا کہ اتنے کے ہیں۔ ہم نے اشارے سے کہا ''چھ کباب دے دو اور خبس (روٹی) بھی''۔ کباب تیار ہونے تک اس نے ہمارے سامنے لکڑی کے بنچ پر

''تر'' اور ٹماٹر کا باریک سلاد رکھ دیا جو ہم نے کباب آنے تک ''فارغ'' کر دیا۔ کباب تیار ہو کر جیسے ہی ہمارے سامنے آئے ہم نے کھانا شروع کر دیئے۔ پہلے لقمہ سے پاکستانی کباب کا مزہ آیا کیوں کہ ان میں نمک اور مرچ عراق میں پکنے والے باقی سالن وغیرہ کی نسبت زیادہ مگر ہمارے ذائقہ کے عین مطابق تھا۔ چھ کے بعد تین کباب اور لئے اور سیر ہو گئے۔

بالکل ساتھ ہی نوعمر لڑکا چائے والا پھٹہ لگائے کھڑا تھا۔ راشد نے اسے انگلیوں کے اشارے سے کہا ''دوشائے'' کیوں کہ عربی میں چائے کو ''شائے'' بولتے ہیں۔ اس نے جھٹ سے شیشے کے صراحی نما چھوٹے سے برتنوں میں گرم پانی میں پتی اور باریک چینی ڈال کر ہمیں دے دی۔ عراق میں چائے میں چینی ڈال کر دیتے ہیں جب کہ ایران میں بغیر چینی کے قہوہ نما چائے دیتے ہیں۔ اس چائے میں پتی کافی تیز تھی اس لئے مجھ سے تو پی نہ گئی اور چند گھونٹ لینے کے بعد میں نے کڑواہٹ کی وجہ سے واپس رکھ دی۔ چائے کی پیالی پورے عراق میں 150 دینار کی ملتی ہے۔ واپسی پر دوسرے راستے سے گشت کرتے ہوئے ہم واپس مزار غوث اعظمؒ آ گئے۔

راستہ میں ہم نے ایک فوٹو سٹوڈیو سے کلر فوٹو فلم کی قیمت پوچھی تو اس نے آٹھ ہزار دینار بتائے جب کہ قبل ازیں میں نے اپنے گائیڈ سے چھ ہزار دینار (چار سو روپے پاکستانی) میں کلر فلم منگوائی تھی۔ مجھ سے کیا تمام حضرات سے غلطی یہ ہوگئی تھی کہ وہ کیمرہ میں موجود ایک سے زائد فوٹو فلم پاکستان سے ساتھ لے کر نہیں گئے اور اس کا خمیازہ ایک کی بجائے چار فلموں کی قیمت ادا کرنے کی صورت میں بھگتنا پڑ رہا تھا۔ روزانہ کے پروگرام کی طرح رات نماز عشاء سے فارغ ہونے کے بعد ہم ہوٹل پہنچے اور ابھی کمروں میں کپڑے وغیرہ بدل کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ شور مچ گیا کہ بیشتر کمروں میں مقیم حضرات کے سامان میں رکھے گئے ڈالر اور دینار غائب ہیں۔ میں نے باہر سے صورت حال معلوم کرنے کے بعد دوبارہ کمرہ میں آ کر اپنا بریف کیس دیکھا تو وہ خلاف توقع لاک نہیں تھا۔ میری پریشانی ایک دم بڑھ گئی کہ میرے ساتھ بھی ہاتھ ہو گیا مگر جب ڈالرز، دینار، روپے اور دیگر سامان چیک کیا تو اطمینان ہوا کہ

خوش قسمتی سے بچ گئے۔

میں کافی دیر سوچتا رہا کہ بریف کیس آج کھلا کیسے رہ گیا! دوسری جانب مختلف کمروں سے خواتین وحضرات یکے بعد دیگرے اپنی چوری شدہ رقم کے اعداد وشمار کے ساتھ برآمد ہو رہے تھے۔ زیادہ تر نیچے لابی میں جمع ہو کر شور مچا رہے تھے بعض نے تو سامان تک باندھ کر نیچے رکھ لیا کہ اس ہوٹل میں وہ ایک منٹ نہیں رہنا چاہتے۔ منتظمین الگ پریشان تھے کہ یہ ہو کیا گیا؟ کیوں کہ چور جو غالب امکان تھا کہ صبح کمروں کی صفائی کے لئے متبادل چابی کی مدد سے دروازہ کھول کر اندر آنے والی ہیلپر اور خاکروب لڑکیاں اور لڑکے ہیں نے بیگز کے کنڈے اور تالے توڑ کر کپڑوں کی جیبوں تک سے کرنسی نکال لی تھی۔ یہ مشکوک لڑکے اور لڑکیاں اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ ہوٹل کی انتظامیہ پہلے تو لاتعلقی کا اظہار کرتی رہی پھر دباؤ کے بعد مینیجر کہنے لگا کہ صبح وہ کام کرنے والوں سے اس بارے معلوم کریں گے۔

موصل روانگی

پروگرام کے مطابق ہمیں الصبح 4 بجے شمالی عراق میں واقع مرکزی شہر موصل روانہ ہونا تھا۔ ٹور منتظمین نے ہوٹل انتظامیہ کو کہا کہ وہ ہماری واپسی تک چوری شدہ رقم کی واپسی کا بندوبست کریں ورنہ پولیس کو رپورٹ کر دیں گے۔ رات سونے کے لئے بہت کم وقت ملا اور صبح 4 بجے جلدی جلدی تیار ہو کر ہم لوگ موصل کے لئے روانہ ہو گئے۔ بغداد کی سڑکیں، گلیاں اور بازار خاموش تھے جب ہم ان میں سے گزرتے ہوئے موصل کے لئے جانے والی شاہراہ پر جا نکلے۔ موصل جس کا پرانا نام ''نینوا'' تھا کا بغداد سے فاصلہ تقریباً 350 کلومیٹر ہے۔ ہماری بسیں عموماً 70،60 کی سپیڈ سے چلتی تھیں۔ شہر سے باہر ایک پٹرول پمپ پر نماز فجر کے لئے رکے تو وہاں وضو کے لئے پانی دستیاب نہیں تھا۔ تیمّم کے بعد ایک صاف جگہ پر نماز ادا کر کے دوبارہ سفر شروع ہو گیا۔ عراقی ہائی وے ''دو رویہ'' (One Way) تھی اور نہایت اچھی حالت میں۔ ٹریفک خاصی کم تھی لیکن ہماری بسیں اپنی معمول کی رفتار سے رواں دواں تھیں۔ سورج نکل آیا تھا جس کی روشنی میں تا حد نگاہ بنجر علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ سڑک سے دُور کئی جگہوں پر آئل فیلڈز اور فوجی چھاؤنیاں نظر آئیں۔ فوجی چھاؤنی میں عام طور پر دو تین گاڑیاں سلامت نظر آتی تھیں اور عمارات بھی پختہ نہیں تھیں لیکن ان چھاؤنیوں اور آئل فیلڈز کے گرد سخت حفاظتی اقدامات تھے۔

ہائی وے پر کہیں کوئی موڑ یا رکاوٹ نہیں تھی اور منصوبہ بندی کے تحت ریلوے لائن پر فلائی اوور بنایا گیا تھا۔ عراقی ریلوے کی حالت پاکستان ریلوے سے بھی ''پتلی'' نظر آتی ہے۔ ہمارے بائیں جانب کچھ دُور ریلوے لائن پر گاڑی گزر رہی تھی جس کے اکثر ڈبے مسافروں سے خالی تھے اور ان کا رنگ و روغن بھی ماند پڑا تھا۔ ریل کے زیادہ تر انجن ڈیزل سے چلتے

ہیں۔ ریلوے پھاٹک کی بجائے لائن کے ایک طرف بیریئر لگا تھا اور چند ایک کمروں پر مشتمل گھر کی طرز پر ریلوے اسٹیشن تعمیر کئے گئے تھے۔ ہائی وے کے اِردگرد کہیں کہیں نظر آنے والی بستیوں میں پاکستانی طرزِ تعمیر پر بنے مکانات نظر آتے تھے۔ راستے میں واقع ایک دو ہوٹلز سے کھانے کا پتہ کیا مگر نہ ملا۔ سب کو ناشتہ بھی نہ مل سکا تھا۔ خالی پیٹ ہی قریباً 11 بجے ہم موصل شہر کی حدود میں داخل ہوئے۔ شہر کے باہر تو کچے مکانوں والا دیہاتی سا علاقہ تھا مگر وسط میں شہر بہت صاف ستھرا اور خوبصورت نظر آیا۔ مکانات جدید طرز کے تھے اور ہوٹلز کی بلند و بالا عمارات حیران کر دینے والی تھیں۔ ایک جگہ کافی بلندی سے نیچے دیکھا تو پل سے نیچے دریا کا نیلگوں پانی بہہ رہا تھا۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ دریائے دجلہ ہے جو بغداد سے بہتا ہوا شمالی عراق کے اس شہر موصل سے گذر رہا ہے۔ یہاں بھی بغداد کی طرح دریائے دجلہ کے دونوں طرف شہری آبادیاں ہیں۔

12 بجے ہماری بسیں ''موصل یونیورسٹی سٹی'' جا کر رکیں۔ منتظمین نے ایک ہوٹل سے کھانے سے متعلق معلومات لیں اور ہم نے وہاں ناشتہ اور دوپہر کا کھانا اکٹھا کھایا۔ یہاں پر گوشت، دال، چاول اور کباب دستیاب تھے مگر ہم نے سالن کا ذائقہ کھٹا محسوس ہونے پر چاول جنہیں عربی میں ''تمن'' کہتے ہیں اور کباب لے کر پیٹ بھرا۔ کھانے کے بعد چائے پی کر ہم باہر نکلے تو ساتھ کی دکان پر مختلف پھلوں کے جوس نکالے جا رہے تھے۔ ہم سے پہلے جوس لینے والے حضرات نے ذائقہ کی اتنی تعریف کی کہ ہم سے رہا نہ گیا اور ہم نے انار کا جوس پیا جو واقعی مزیدار تھا۔ سامنے سڑک کے پار موصل یونیورسٹی کی قدیم عمارت تھی جس پر پیلا پینٹ ہوا تھا۔ سٹوڈنٹ لڑکے پینٹ شرٹ جب کہ لڑکیاں زیادہ تر سکرٹ میں تھیں۔ بال کھلے اور اکثر نے چشمے بھی لگا رکھے تھے۔ ایسے میں اِکا دُکا لڑکیاں اوورکوٹ اور سکارف اوڑھے بھی نظر آئیں۔ ہماری بس کے ساتھ ہی لڑکوں کا ایک گروپ پاس سے گزرنے والی دو لڑکیوں پر ہلکے سے آوازے کستا نظر آیا غالباً ان کی تعریف کی ہوگی جس کا وہ نوٹس لئے بغیر آگے بڑھ گئیں۔

بسوں میں ہم واپس شہر کی طرف جا رہے تھے تو ایک جگہ بریکیں لگ گئیں۔ ہمارے

بائیں جانب پہاڑ کی سی اونچائی پر ایک عمارت تھی۔ یہ حضرت یونس علیہ السلام کی عبادت گاہ تھی اور لوگوں نے یہاں عمارت تعمیر کر دی کہ اس جگہ آپ علیہ السلام کی قبر ہے حالانکہ آپ علیہ السلام بیت المقدس میں مدفون ہیں۔

عمارت کے مرکزی دروازہ تک پہنچنے کے لئے 115 سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں جب کہ 25 سے زائد سیڑھیاں جائے عبادت اور ملحقہ مسجد تک ہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام کو ایک مچھلی نے نگل لیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو زندہ رکھا اور مچھلی کے پیٹ سے آزادی دلائی تھی۔ یہ جگہ اتنی بلند ہے کہ پورے موصل شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح جیسے مینار پاکستان سے لاہور شہر نظر آتا ہے۔ یہاں نماز ظہر کی جماعت ہو رہی تھی جس میں ہم بھی شامل ہو گئے۔ ہمارا اگلا قیام شہر کے اندر واقع حضرت شیث علیہ السلام کے مزار پر تھا۔ آپ علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ آپ علیہ السلام نے 1057 سال عمر پائی۔ قبر پر سبز رنگ کی چادر ڈالی گئی تھی۔ عمارت خاصی بڑی تھی جس میں سنگ مرمر کے پتھر پر قرآنی آیات کی خطاطی بہت متاثر کرتی ہے۔ ملحقہ مسجد کی تزئین و آرائش بھی بہت عمدہ تھی اور صحن میں الگ تھلگ بہت بڑا مینار ہے جو 1406ھ کا بنا ہوا ہے۔

شہری آبادی کے درمیان سے گزر کر بسیں علاقہ عموالبقال جا کر رکیں جہاں سڑک کے کنارے چار دیواری میں حضرت جرجیش علیہ السلام کا مزار اقدس ہے۔ پہلے مسجد ہے جو نئی تعمیر ہوئی ہے اور آگے نیچی جگہ پر قبر کے اوپر لکڑی کا تابوت ہے جس کے اوپر کی طرف چار پائے ہیں۔ اس لکڑی میں دراڑیں ہیں اور آیات بھی کندہ ہیں۔ اندر شیشے کا کور (Cover) نظر آتا ہے۔ جگہ تنگ ہے اور زیادہ آدمی اندر نہیں ٹھہر سکتے۔ اندر ہی بائیں طرف کی دیوار میں ایک جگہ موٹا شیشہ لگا ہوا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس جگہ حضور نبی کریم ﷺ کے موئے مبارک محفوظ ہیں جنہیں عقیدت و محبت سے بوسہ دیا جاتا ہے۔ دیکھنے سے موئے مبارک نظر نہیں آتے۔ مزار کے اوپر پرانی طرز کا گنبد ہے۔

موصل کے علاقہ حی الشفاء میں تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے ہم حضرت دانیال علیہ السلام

کے مزار انور پر پہنچے۔ حضرت دانیال علیہ السلام خواب کی تعبیر سب سے مستند بتاتے تھے۔ آپ علیہ السلام کے مزار کے اِردگرد آبادی ہے اور اس کی نئی عمارت 1401ء میں مقامی اوقاف نے تعمیر کروائی۔ لوہے کے جنگلے سے نیچے اُتر کر قبر تک جانا پڑتا ہے جس کے اِردگرد قالین بچھا ہے۔ قبر پر چادر ہے اور نیچے لکڑی کا تابوت نظر آتا ہے۔ دوسری طرف گہرائی میں کنواں بھی ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ حضرت دانیال علیہ السلام کی قبر اصل جگہ سے پھسل کر کنواں میں چلی گئی ہے۔ کئی حضرات نے نیچے اُتر کر اس کنواں کو بھی دیکھا۔

موصل میں گرمی کافی محسوس ہو رہی تھی اور ایئر کنڈیشنڈ بسوں میں بیٹھ کر کچھ دیر کے لئے سکون مل جاتا۔ ایک مرتبہ پھر سڑک پر اُترے تو گائیڈ نے بتایا کہ سامنے حویلی میں بھی مزارات ہیں۔ یہاں حضرت سری سقطیؒ اور حضرت جنید بغدادیؒ کے ہمعصر اور موصل کے بہت بڑے بزرگ الشیخ قضیب البان الموصلی اور ان کی بہن کے مزارات ہیں ان کے علاوہ حضرت غوث اعظمؒ کے بیٹے عیسی بن شیخ عبدالقادر اور موسیٰ بن شیخ عبدالقادر بھی مدفون ہیں۔ اندر مسجد بھی ہے جس کی بیرونی تزئین وآرائش خوب ہے۔ اس عمارت کے دروازے کے کھولنے والے حضرات کی عدم دستیابی کی بناء پر سب نے باہر کھڑے ہو کر ہی فاتحہ خوانی کی۔

ہمارے ساتھ سفر کرنے والے جامعہ صدام کے پاکستانی طالب علم عظمت نے بتایا کہ پاس ہی شیخ فتح موصلیؒ کا مزار ہے۔ فتح موصلی حضرت معروف کرخیؒ کے ہمعصر تھے اور ان کے بارے میں مشہور تھا جو بات بھی کہتے پوری ہوتی تھی۔ مزار پر حاضری کے لئے چلے تو فاصلہ توقع سے زیادہ نکلا۔ کئی حضرات تو پیدل چلتے ہوئے تھک گئے۔ مزار چار دیواری کے اندر واقع ہے جس کی پرانی اور خستہ حال عمارت کی دیواروں میں دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ لوہے اور لکڑی کے یکے بعد دیگرے 3 دروازے ہیں جن سے گذر کر نشیب میں واقع قبر تک پہنچا جاتا ہے۔ اوپر چھوٹا سا گنبد ہے جو سفید رنگ کے پتھر سے بنا ہے۔ یہاں پانی موجود تھا جسے دیکھ کر سب کی پیاس جاگ اٹھی۔ سڑک ون وے ہونے کی وجہ سے یہاں بسیں آنا ممکن نہ تھا اس لئے سب کو پیدل واپس جانا پڑا۔

سرمن رای (سامرہ)

یہ شہر بغداد سے 124 کلومیٹر فاصلہ پر صلادین صوبہ میں واقع ہے۔ عصر اور مغرب کے درمیان ہم ''سامرہ'' شہر کے لئے روانہ ہوئے۔ سامرہ شہر جو عباسی دور میں کچھ عرصہ دارالحکومت بھی رہا کو عباسی خلیفہ المستنصر بلا نے 836ء (221ھ) میں تعمیر کروایا تھا۔ ''سامرہ'' کا اصل نام سُرّمَنْ رَاٰی ہے ''جس نے ایک بار دیکھا پھر من چاہا''۔

سفر اتنا تھا کہ ہم عشاء کے وقت سامرہ پہنچے۔ یہاں حضرت امام حسن بن علی نقی رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ نرجس خاتون، حضرت امام علی نقی رضی اللہ عنہ اور ان کی ہمشیرہ حضرت حلیمہ خاتون کے عالیشان مزارات ہیں۔ رات کے وقت مزارات کی پرشکوہ عمارت پر اس قدر رنگ و نور آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ مزارات کے احاطہ کے مرکزی دروازہ پر دو مینار ہیں جن کی اونچائی 36 میٹر ہے اور ان پر سونا لگا ہوا ہے۔ حضرت امام علی نقی رضی اللہ عنہ جن کا پورا نام امام علی الہادی بن محمد الجواد رضی اللہ عنہ ہے کا انتقال 868ء (254ھ) میں ہوا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے بیٹے الحسن العسکری رضی اللہ عنہ کی قبریں ایک گنبد تلے ہیں۔ اس عالی شان گنبد کی چوڑائی گولائی 68 میٹر ہے اور اس پر سونے کی 72000 اینٹیں لگی ہوئی ہیں گنبد کے اوپر سرخ رنگ کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اس سے تھوڑا آگے دونوں مستورات کے مزارات ہیں جن پر سبز نیلے رنگ کا بڑا گنبد ہے۔

سب سے پہلے یہ گنبد ناصرالدولہ الحمدانی نے 945ء (333ھ) میں تعمیر کروائے تھے۔ اس نے مزارات کے گرد مضبوط چار دیواری بھی بنوائی۔ بعد میں عباسی خلیفہ مستنصر بلا نے گنبد کے لکڑی کے باکس کو تبدیل کر کے ساگوان کی لکڑی کے نئے باکس لگوا دیئے اور اس نے مزار اور چار دیواری کی تزئین و آرائش بھی کروائی تھی۔ اس کے بعد خلیفہ ناصرالدین نے مزارات پر کچھ نئی تعمیرات کروائیں۔ مزار کی ابتدائی تعمیر اور اس کے بعد کے عرصہ میں تعمیر نو

کے علاوہ سب سے زیادہ توجہ 1785ء (1200ھ) میں دی گئی اور موجودہ شکل میں نظر آنے والے گنبد اور مینار اسی دور میں مکمل ہوئے۔

یہ گنبد پوری اسلامی دنیا میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا گنبد ہے اور مینار اپنی مثال آپ ہیں۔ مزارات کے درمیان واقع جگہ پر جہاں خوبصورت قالین بچھے ہوئے تھے ہم نے عشاء کی نماز ادا کی اور کافی دیر وہاں موجود رہے کیوں کہ روشنیوں اور ٹھنڈک میں ماحول بہت پاکیزہ اور اُجلا اُجلا محسوس ہو رہا تھا۔ باہر نکلے تو بھوک ستا رہی تھی۔ کھانے کے لئے چیز کی تلاش میں میں اور عارف سعید دکانیں دیکھ رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی ''رفیق، رفیق!'' میں نے کہا دیکھتے ہیں یہ کون ہے! واپس مڑے تو ایک موٹا سا دکاندار ہمیں کہنے لگا ''رفیق ڈالر چینج'' اور ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔ میں نے کہا ''لا'' اور ہم آگے بڑھ گئے کیوں کہ ہمارے پاس پہلے ہی کافی دینار تھے۔ باقی ساتھی بھی کھانے پینے کے لئے مختلف دکانوں پر پھر رہے تھے۔ ہم نے تو کچھ پھل کھا کر گذارا کر لیا اور بس میں آ بیٹھے۔ رات گیارہ بجے واپس بغداد میں اپنے ہوٹل پہنچے اور بستروں پر دراز ہو گئے۔

عراقی عوام اور کشمیر

دوپہر تک باہر جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا اس لئے میں اور راشد کافی دیر تک کمرے میں پڑے رہے۔ بعد میں اٹھ کر سامنے واقع فائیو سٹار ہوٹل فلسطین کے سوئمنگ پول کا کچھ دیر نظارہ کرتے رہے۔ راشد نے کہا یار کپڑے ہی دھولیں کیوں کہ ہوٹل میں لانڈری والے ایک سوٹ کی دھلائی اور استری کے ہزار، بارہ سو دینار سے کم نہیں لیتے تھے اور پھر دیتے بھی ایک آدھ دن بعد تھے۔ راشد کے پاس سرف کا چھوٹا پیکٹ تھا۔ میں نے کپڑے اکٹھے کر کے باتھ ٹب میں پانی بھر کر ڈال دیا اور سرف ڈال کر دھلائی کی کوشش کی جب کہ راشد باہر نکل گیا۔ میں نے کچھ دیر بعد دیکھا تو وہ لفٹ کے سامنے رکھی کرسی پر ایک عمر رسیدہ شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ کپڑوں کے ساتھ تھوڑی سی محنت کے بعد میں بھی ان کے پاس پہنچ گیا۔ راشد نے دلچسپی سے مجھے بتایا کہ یہ بابا جی عراقی ہیں اور عربی کے علاوہ انگریزی اور اُردو بھی بولتے ہیں۔ میں نے بابا جی کو غور سے دیکھا تو وہ 50 سال سے زائد عمر کے آدمی تھے مگر صحت کے اعتبار سے وہ چلنے پھرنے کے علاوہ اور کسی کام کے قابل نظر نہیں آتے تھے۔ بزرگ شخص کا کمرہ ہمارے بالکل سامنے تھا۔ اس نے بتایا کہ ہوٹل والے اس سے صرف 4 ہزار دینار ماہانہ لیتے ہیں جو اس کا کوئی خیر خواہ ادا کر دیتا ہے کیوں کہ وہ خود تو کمانے کے قابل ہی نہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ حکومت عراق کی طرف سے بہت عرصہ کویت میں رہا اور ایک کمپنی میں نگران کا کام کرتا رہا۔ کویت پر عراقی قبضہ اور پھر واپسی کے بعد وہ بھی عراق آ گیا۔ اس کی والدہ برطانیہ کی تھی اور والد بھی انگریز تھا۔ والدین نے اسے بہت کہا کہ وہ برطانیہ آ جائے لیکن وہ نہیں گیا اور عراق میں رہا۔ شادی بھی نہیں کی۔ مے نوشی کی عادت تھی اب قلاش اور بے سہارا ہونے پر جو لوگ اسے جانتے ہیں اس کی رہائش اور کھانے پینے کے لئے کچھ مدد کر دیتے

ہیں۔ یہ تو بزرگ نے اپنا تعارف کروایا لیکن راشد نے پاک عراق تعلقات کی بات چھیڑ رکھی تھی کہ عراق کا جھکاؤ پاکستان کی نسبت بھارت کی طرف زیادہ ہے حالانکہ پاکستانی عوام عراق کی بہت حمایت کرتے ہیں۔ خلیج کی جنگ میں اتحادیوں کے عراق پر حملہ کے خلاف پاکستان کے عوام نے زبردست احتجاج کیا اور عراق کی حمایت میں جلوس نکالے۔ اس پر بزرگ نے کہا کہ عراق میں لوگوں کو صحیح طور پر یہ علم ہی نہیں کہ پاکستان کی کیا حیثیت ہے۔ انہیں بھارت (انڈیا) کا زیادہ پتہ ہے اور بھارت کی حکومت عراقی حکومت سے بھی اچھے تعلقات استوار کئے ہوئے ہے۔ میں نے کشمیر کا موضوع اٹھایا کہ عراق بھارت کا زیادہ دوست ہے اور بھارت کشمیر کے مسلمانوں پر ظلم کر رہا ہے اس کی فوجیں بے گناہ کشمیریوں کو قتل کر رہی ہیں۔ عراق کو بھارت پر دباؤ ڈالنا چاہئے کہ وہ کشمیری مسلمانوں پر ظلم وزیادتی بند کرے اور انہیں حق خودارادیت دے۔ بزرگ نے پوچھا ''یہ کشمیر کیا ہے؟'' میں نے مختصر بتایا کہ تقسیم ہند کے وقت بھارت نے کشمیر وادی پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا حالانکہ کشمیری مسلمان اکثریت کی وجہ سے بھارت کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اس مسئلہ پر پاکستان اور بھارت کے درمیان دو جنگیں بھی ہو چکی ہیں اور اقوام متحدہ نے قراردادیں منظور کر رکھی ہیں کہ کشمیریوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا موقع دیا جائے اور بھارت سے آزادی کے لئے وہاں استصواب رائے ضروری ہے۔

بزرگ نے یہ سننے کے بعد اچانک نیا سوال کر دیا کہ پاکستان کی آبادی کتنی ہے؟ میں نے بتایا کہ 12 کروڑ سے زائد۔ بزرگ نے کہا ''ملین'' میں بتاؤ! میں نے کہا ''ایک سو بیس ملین''۔ بزرگ نے حیران ہو کر کہا ''اوہ اٹ از ٹو مچ''، ''عراق اونلی ٹونٹی ملین'' (یہ تو بہت زیادہ ہے جب کہ عراق کی آبادی صرف 2 کروڑ ہے)۔ میں نے تو 1981ء کی مردم شماری سے بھی کم آبادی بتائی تھی اب تو خیر سے 15 کروڑ کا ہندسہ بھی کراس ہو چکا ہے۔ بزرگ نے کہا کہ آپ کی حکومت کو چاہئے کہ وہ عراق میں پاکستان اور مسئلہ کشمیر سے متعلق حالات اور اہمیت بہتر طریقے سے بتانے کا انتظام کرے تا کہ بھارت کے خلاف رائے عامہ ہموار ہو سکے۔

سگ بغداد کا تعاقب

راشد نے مجھے یاد دلایا کہ ہم نے تو باہر گھومنے جانا ہے۔ تو ہم نے کمرہ میں آ کر کپڑے بدلے اور اپنے اپنے کیمرے لے کر ہوٹل سے باہر آ گئے۔ سامنے سڑک کے دوسری طرف دریائے دجلہ کا کنارہ تھا اور سڑک کے ساتھ اوپن ایئر ہوٹل تھا جو رات کو کھلا ہوتا اور صبح بند پڑا تھا۔ راشد نے اچانک کہا ''دریائے دجلہ دیکھتے ہیں''۔ میں نے فوراً مخالفت کرتے ہوئے کہا ''دریا کا کیا دیکھنا، دیکھو سامنے قد آور گھاس پھونس اُگی ہوئی ہے اور پھر خاردار تار بھی لگی ہے۔'' راشد نے سامنے دیکھتے ہوئے جواب دیا: ''دیکھو سامنے راستہ ہے''۔ جہاں سے ایک کتا گزر کر دریا کے پانی کی طرف جا رہا تھا اور دریا کا پانی کنارے سے خاصا دور تھا اور نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے طنزاً کہا ''جناب وہ سگ بغداد ہے اور اس جگہ سے گذر سکتا ہے، ہم نہیں''۔ راشد نہ مانا اور اس طرف بڑھ گیا مجبوراً میں بھی پیچھے چل دیا۔ ہمارے سامنے دو تین کمروں کی عمارت تھی جس کے دروازے دریا کی سمت تھے اس لئے ہمیں اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ کیا ہے؟

باتیں کرتے ہوئے جیسے ہی ہم عمارت کے دروازے کی طرف آئے اندر سے ایک عراقی فوجی نکل آیا اور ہماری طرف بڑھا۔ پاس آ کر اس نے کہا ''السلام علیکم'' ہم نے وعلیکم السلام کہہ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ اس نے عربی میں کچھ کہا جس کی ہمیں سمجھ آنی تھی نہ آئی۔ جواباً میں نے کہا ''پاکستانی!'' اس نے کہا ''اھلاً وسہلاً'' اور ساتھ ہی ہمیں عمارت کے اندر ایک کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا اور خود باہر نکل گیا۔ میں نے پہلے تو راشد کو کہا ''شاید چائے پانی کا بندوبست کر رہا ہے''۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہمیں دیکھ کر دوبارہ باہر گیا تو مجھے خطرے کی بو محسوس ہوئی۔ میں نے راشد سے کہا ''ذلیل آدمی! تمہیں منع بھی کیا تھا کہ اس طرف جانے کا کوئی فائدہ نہیں اب دیکھ لو دریائے دجلہ!'' یہ عربی بول رہا ہے اور ہماری اسے سمجھ نہیں آ رہی،

کون ہمیں چھڑوائے گا؟

اتنی دیر میں وہ پھر آیا تو میں اور راشد اُٹھ کھڑے ہوئے اور زبردستی کمرے سے باہر آ گئے۔ ہمارے پاس اپنے ہوٹل کا کارڈ تھا جو میں نے اسے دکھایا۔ ہماری کوشش تھی کہ یہاں سے نکلا جائے جب کہ وہ ہمیں روکنے کے چکر میں تھا۔ وہ عربی فرفر بول رہا تھا جس کی ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی جب ہم آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے عمارت کے ایک طرف آ گئے تو اس نے راشد کو اشارہ کیا کہ یہ کیمرہ اسے دو۔ راشد نے دے دیا تو وہ اسے کھول کر فلم نکالنے کی کوشش کرتا رہا مگر اسے شاید کیمرہ کھولنا نہیں آتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے بعد یہ میرا کیمرہ کھول دے گا تو قیمتی تصاویر ضائع ہو جائیں گی۔

میں نے عربی فارسی مکس کر کے کہا ''لاعکس این جاعکس زیارات'' بات اس کی سمجھ میں آ گئی جس پر اس نے کیمرہ راشد کو واپس کر دیا۔ میں نے سپاہی کا نرم رویہ دیکھ کر راشد کو کہا ''نکلو یہاں سے'' اور ہم تیزی سے عمارت کے پچھلی طرف آ گئے۔ سپاہی ہمارے ساتھ ساتھ تھا مگر خاموش۔ میں نے پھر عربی میں تکا لگایا ''جائے ممنوعہ!'' جواباً اس نے عربی میں کچھ کہا اور ساتھ ہی دونوں ہاتھوں کی کلائیاں ملا کر اشارہ کیا کہ گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ اس دوران پگڈنڈی پر چلتے ہوئے سپاہی کی نظر راشد کے ہاتھ میں پکڑی تسبیح پر پڑ گئی۔ اس نے اشتیاق سے پوچھا ''باکستانی تسبیح!'' میں نے جھٹ سے تسبیح راشد کے ہاتھ سے پکڑی اور سپاہی کو تھماتے ہوئے کہا ''تحفہ، تحفہ''۔ وہ تسبیح لے کر خوش ہو گیا اور پھر اس نے ہمیں اشارہ کیا کہ وہ اپنے ہوٹل اس راستہ سے جائیں۔ ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چند لمحوں میں ہوٹل کے سامنے سڑک پر پہنچ گئے تو سکون کا لمبا سا سانس لیا۔ میں نے راشد پر چڑھائی کر دی ''تو نے آج مروا دیا تھا ہمارے پاس تو شناخت کے لئے پاسپورٹ بھی نہیں تھا پکڑے جاتے تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلنا تھا کہ کہاں گئے اور جاسوس سمجھ کر ہمیں گولی سے اڑا دیتے تو کس نے پوچھنا تھا''۔ راشد نے شرمندگی سے جواباً کہا ''شکر کرو بچ گئے اب جلدی سے کمرے میں چلو''۔ کمرے میں لیٹے لیٹے خاصی دیر طرح طرح کے خیال آتے رہے پھر تھوڑی دیر بعد نیند آ گئی۔

علی بابا چالیس چور اور امریکی

عصر کے وقت ہم نے پروگرام بنایا کہ ''باب شیخ'' پیدل چلتے ہیں کیوں کہ کسی دوست نے بتایا تھا کہ قریب ہی ہے۔ کھلے بازاروں کے درمیان چلتے چلتے ہم کافی دُور نکل گئے۔ بغداد میں ''چوک'' کافی زیادہ ہیں۔ ایک مشہور ''علی بابا'' چوک ہے جہاں پر 40 مٹکے بنائے گئے اور ''علی بابا 40 چور'' کا کردار مرجینا ایک مٹکے سے پانی ڈال رہی ہے جو تمام مٹکوں سے اُبلتا دکھائی دیتا ہے۔

عراق میں شاید ہی کوئی شخص ہوگا جو ''علی بابا'' کا نام نہ جانتا ہو کیونکہ یہ مشہور عرب لوک کہانی ''علی بابا چالیس چور'' کا کردار ہے۔ 9اپریل 2003ء کو سقوط بغداد کے بعد لاقانونیت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا تو امریکی فوج جس نے پہلے اس لوٹ مار پر خاموشی اختیار کیے رکھی پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ دکانوں سے سامان اور سرکاری دفاتر اور بنکوں وغیرہ سے قیمتی اشیاء لوٹنے کے بعد انہیں جلانے کا عمل شدت سے جاری تھا کہ امریکیوں نے اس کے خلاف کارروائی میں علی بابا جیسے شخص کے تاریخی کردار کو مسخ کر دیا۔ چونکہ امریکی عربی زبان جانتے نہیں تھے اور لوٹ مار کرنے والے لڑکوں اور گروہوں کو جب وہ انگریزی میں خبردار کرتے یا بلاتے تو کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ ایسے میں امریکی نام لئے بغیر لوٹ مار کرنے والے مقامی افراد کو ''علی بابا'' کہہ کر پکارتے تو وہ متوجہ ہو جاتے تھے۔ اس دوران امریکیوں نے کئی مقامی افراد کو لوٹ مار کے الزام میں پکڑا اور برہنہ کر کے بغداد کے ایک پارک میں رکھا ہوا تھا کہ تین فوٹو گرافرز نے ان کی تصاویر کے ساتھ سٹوری نشر کی۔ ان میں سے ایک تصویر میں گرفتار شخص کی چھاتی پر عربی میں ''علی بابا، چور'' لکھا ہوا تھا۔ اسی واقعہ پر ایمنسٹی انٹرنیشنل نے امریکہ پر سخت تنقید کی تھی لیکن نتیجہ صفر۔ کچھ دنوں بعد جواباً بغداد کی حیفا سٹریٹ جہاں

بہت لوٹ مار ہوئی تھی کسی نے دیوار پر نمایاں انداز میں لکھا تھا ''اصل علی بابا امریکہ ہے''۔

بغداد میں امریکی قبضہ کے بعد لوٹ مار اور نفسانفسی ویسے تو فطری بات تھی مگر امریکیوں کے ساتھ ساتھ بعض مقامی لوگ اس کا الزام سابق صدر صدام حسین کو دیتے ہیں کہ ایک تو اس نے اپنی عوام کو غربت میں رکھا دوسرا اس نے چند ماہ قبل ہزاروں جرائم پیشہ قیدیوں کو جیلوں سے رہا کیا تھا۔ جنہوں نے مبینہ طور پر بغداد میں لوٹ مار اور گھیراؤ جلاؤ کی کارروائیاں کیں۔ لیکن زیادہ تر عراقی عوام اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کا اس امر پر اتفاق پایا گیا کہ امریکی فوجیوں نے جان بوجھ کر املاک کو لوٹنے اور سرکاری اداروں کو برباد کرنے کی کھلی چھٹی دی اور کارروائی مکمل ہونے تک خاموش تماشائی بنے رہے۔

کئی ایک جگہ سے معلوم کیا کہ ''باب شیخ''! تو ہر کوئی آگے کی طرف اشارہ کر دیتا۔ ایک چوک میں ہمارے لنڈا بازار کی طرز پر کپڑے سیل ہو رہے تھے۔ عورتیں پھلوں کی عارضی دکانیں سجائے بیٹھی تھیں اور سگریٹ بیچنے والے بھی پھٹے لگائے خاموشی سے فٹ پاتھ پر بیٹھے تھے۔ ان کے پاس کوئی گولڈ لیف یا کوئی اور امپورٹڈ برانڈ نہیں تھا۔ سمرنامی برانڈ کی سگریٹ کی ڈبیا بیچ رہے تھے اور اس کی بھی ایک سگریٹ 50 دینار کی تھی۔ تھک ہار کر ہم ٹیکسی میں بیٹھے اور باب شیخ پہنچ گئے وہاں مسجد میں نماز عصر ادا کی اور مزار کے عقب میں ایک بازار میں دو بزرگوں کے مزار تھے ان پر حاضری کے لئے تین چار دوست چل پڑے۔ ایک مزار کا دروازہ تو کھلا تھا جب کہ دوسرا بند تھا۔ ان تک راستہ بازار میں سے جاتا تھا جس میں زیادہ تر دوکانیں سبزی اور نمک مرچ کے علاوہ دیگر روزمرہ کی اشیاء کی تھیں۔ بازار سے سڑک پر آنے سے تھوڑا پہلے بائیں جانب تھوڑی سی چیزیں رکھے ایک عورت بچہ لئے گھر کے ایک کمرہ کا دروازہ کھول کر دکان سجائے بیٹھی تھی اور ساتھ اس کی دس بارہ سالہ بیٹی تھی۔ ہم پاس سے گذرے تو عورت نے ہمیں اجنبی سمجھ کر غور سے دیکھا۔ میں نے ایک نظر خاتون اور دکان کو دیکھا تو مجھے ترس سا آ گیا کیوں کہ عورت اپنی گذر بسر کے لئے اتنی چھوٹی سی دکان بنا کر بیٹھی تھی۔ عراق

میں یہ المیہ ہے کہ ہر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد جنگ میں ضرور کام آ چکا ہے۔ کسی کا شوہر ہے تو کسی کا بھائی یا بیٹا۔ عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہے اور اوپر سے بظاہر اقوام متحدہ درحقیقت امریکہ کی طرف سے عراق پر اقتصادی پابندیوں اور افراط زر نے بڑوں بڑوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ دکان سے چند قدم آگے گذرنے کے بعد میں نے قاسم اور عارف کو روکا اور کہا ''یار اس دکان سے کوئی چیز ہی خرید لو، چلو ان کی مدد ہی ہو جائے گی''۔ ہم واپس آئے اور قاسم نے سامنے رکھے مغز نکالنے والے بیج کے لفافہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ''کم فی ہذا'' (اس کی کیا قیمت ہے)۔ عورت اور اس کی بیٹی نے فوراً کہا ''عشرہ خمسون'' یعنی 25 دینار اور ساتھ ہی بچی نے شیشے کا ایک چھوٹا جار بھر کر دکھایا کہ اتنی مقدار ہوگی۔

ہم نے سوچا کہ یہ بیج کافی سارے ہیں اور 25 دینار سے انہیں بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا کیوں کہ بغداد میں تو فقیر بھی 25 اور 50 دینار کو سیدھے منہ سے نہیں پکڑتا۔ میں نے انگلی کے اشارے سے کہا کہ ''ایک دے دو''۔ بچی نے شیشے کے جار میں بیج بھرے اور پلاسٹک کے لفافہ میں ڈالتے ہوئے تھوڑے سے فالتو بیج بھی ڈال دیئے اور ایسا کرتے وقت اس کے چہرے سے خوشی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے بیج پکڑ کر 100 دینار کا نوٹ دیا تو میری دلی خواہش تھی کہ یہ 100 دینار ہی رکھ لیں مگر یہ خیال کر کے انہیں کہہ نہ سکا کہ کہیں یہ بُرا نہ مان جائیں کیوں کہ ہر انسان کی ''انا'' ہوتی ہے جسے وہ قائم رکھے تو ہاتھ پھیلانا تو دُور کی بات ہے کسی سے مفت میں ایک پیسہ بھی قبول نہیں کرتا۔ عورت نے 75 دینار شکریہ ادا کرتے ہوئے ہمیں واپس کر دیئے اور ہم آگے بڑھ گئے۔

رات کو عشاء کے بعد ہمارے وفد کے ارکان نے مزار غوث اعظمؒ پر لنگر کا اہتمام کیا تھا اور اس مقصد کے لئے دو روز قبل ایک لاکھ دینار سے زائد کی رقم اکٹھی کر کے مزار کے لنگر خانہ کے انچارج کو دی جا چکی تھی۔ جس سے چاول اور بکرے خرید کر پلاؤ تیار کیا گیا تھا۔ ذکر و فکر اور درود و سلام کی محفل کے بعد سب حضرات لنگر خانہ جو بالائی منزل پر واقع لائبریری کے

نیچے تھا پہنچ گئے۔ ہمارے جانے سے قبل منتظمین نے مزار کے احاطہ میں موجود غرباء اور مساکین کو لنگر تقسیم کر دیا تھا۔ ہم لوگ پانچ چھ افراد کا الگ الگ دائرہ بنا کر بیٹھ گئے اور اسلامی طریقہ کے مطابق ایک بڑے سے تھال میں سب نے سیر ہو کر کھایا۔ ہمارے ساتھ ایک اُدھیڑ عمر خاتون بھی تھی جو اس سفر میں اکیلی تھی اور بدقسمتی سے کوئٹہ سے تفتان آتے ہوئے رات کو ایک جگہ جہاں ہم نے عارضی قیام کیا تھا سڑک پر ٹرک سے ٹکرا کر زخمی ہو گئی تھی اور پوری طرح چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھی۔ جب ہم لنگر خانے کی طرف آ رہے تھے تو میری نظر اس خاتون پر پڑی۔ میں نے اسے کہا ''اماں جی آپ تکلیف نہ کریں آپ بس میں چل کر بیٹھیں میں آپ کے لئے لنگر لے آؤں گا''۔ وہ سمجھ گئی کہ وہاں رش سے اسے مسئلہ پیش آ سکتا ہے۔

جب سب حضرات پلاؤ کھا چکے تو میں نے ایک ساتھی کو جس کے پاس اتفاق سے پلاسٹک کا لفافہ تھا کہا کہ زخمی خاتون کے لئے کھانا لے کر جانا ہے اور لفافہ چاہئے۔ اس نے لفافہ دیا تو میں باورچی خانہ میں چلا گیا اور وہاں بتایا کہ ایک خاتون جو کھانے کے لئے آ نہیں سکتی تھی کے لئے پلاؤ ڈال دو۔ باورچی نے سلور کے بہت بڑے ٹب (کیوں کہ چاول ہمارے ہاں کی طرح دیگ میں نہیں پکائے گئے تھے) میں سے تین کلو سے زائد چاول لفافہ میں ڈال دیئے۔ میں جب لفافہ لے کر باہر نکلا تو تمام ساتھی جا چکے تھے اور مزار کے خادم رات 10 بجے احاطہ کا مرکزی دروازہ بند کر رہے تھے۔ جلدی جلدی وہاں سے نکلا کیوں کہ مجھے فکر لاحق تھی کہ اگر سڑک پر کھڑی بسیں نکل گئیں تو ہوٹل جانے میں مشکل پیش آئے گی۔ جیسے ہی میں مرکزی دروازہ سے نکلا تو راستے میں بیٹھے فقیر عورتوں اور بچوں نے بھاگ کر مجھے گھیرنے اور پکڑنے کی کوشش کی۔ نہ جانے انہیں کیسے علم ہو گیا کہ میرے پاس لفافے میں پلاؤ ہے۔ پہلے تو میں تھوڑا سا گھبرا گیا اور سامنے نظر پڑی تو بسیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں شاید تمام لوگ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ جب میں نے محسوس کیا کہ فقیروں کی یلغار بڑھ رہی ہے تو میں نے دوڑ لگا دی۔ چند ایک فقیروں نے مجھے سامنے سے گھیر کر لفافے کو

ہاتھ بھی ڈالا مگر میں نے پھرتی سے لفافہ بچایا اور ان کے درمیان سے ''زگ زیگ'' دوڑ لگا دی اور فقیروں کا ہجوم بدستور میرے پیچھے تھا جب کہ سامنے بس میں سوار بیٹھے دوست حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جب میں تیزی سے بس کے دوسری جانب گیٹ سے اندر داخل ہوا تو فقیر باہر کھڑے رہ گئے۔ سب دوستوں نے میری تعریف شروع کر دی ''واہ جی واہ کمال کر دیا، ہم تو سمجھے تھے کہ اتنے سارے فقیر آپ کو نکلنے نہیں دیں گے''۔ تیز دوڑنے کی وجہ سے میرا سانس پھولا ہوا تھا اور جھٹ سے راشد کے ساتھ خالی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ بحفاظت پلاؤ سمیت فقیروں کے نرغے سے نکل آیا۔ ہوٹل جا کر ہم نے آدھا پلاؤ خاتون کے کمرہ میں پہنچا دیا اور بقیہ فریج میں رکھ کر خود کھاتے رہے۔

بابل.....قدیم ترین تہذیب جسے پھر لوٹ لیا گیا

نجف روانگی کے لئے صبح 8 بجے کا وقت مقرر تھا مگر تیاری اور ناشتہ کے بعد روانگی 9 بجے ممکن ہوئی۔ ہمیں علم نہیں تھا کہ اب اس ہوٹل میں واپسی ہوگی یا نہیں! اس لئے ہمارے ساتھی بشیر اعوان اور عارف نے مجھے اور راشد سے کہا کہ ہوٹل کی ملازم لڑکیوں بشریٰ اور روبی کے ساتھ ان کی تصاویر بنا دو جو انہوں نے بخوشی بنوائیں۔ بغداد شہر کی کشادہ سڑکوں پر سفر کرتے ہوئے کوئی آدھ گھنٹے بعد ہم ہائی وے پر جا نکلے۔ بغداد سے نجف کا فاصلہ 161 کلومیٹر ہے۔ پہلا سٹاپ بغداد سے 100 کلومیٹر جنوب میں بابل کے تاریخی کھنڈرات تھے۔ جہاں داخل ہونے کے لئے قدیم طرز تعمیر کا حامل بہت بڑا مرکزی دروازہ ہے۔ اندرونی صحن کی دیواروں پر آویزاں بڑی بڑی قدیم پینٹنگز آنے والوں کو متوجہ کرتی ہیں۔ دائیں جانب عجائب گھر ہے جہاں بابل کی ہزاروں سالہ تاریخ پر مبنی تصاویر کے مونو پرنٹ بڑی تعداد میں ہیں اور شیشے کے باکسز میں ان کھنڈرات سے نکلنے والے نوادرات اور قدیم تہذیب کے آثار پر مبنی اشیاء رکھی گئی ہیں۔ یہاں تصاویر بنانے کی اجازت ہے جب کہ ہمارے پاکستانی عجائب گھروں میں اس کی ممانعت ہوتی ہے۔ نوادرات ملی بھگت سے چوری ہو جائیں کوئی بات نہیں باذوق حضرات کو تصاویر بنانے کی ہرگز اجازت نہیں یا پھر اس کے لئے الگ سے ''جگا ٹیکس'' ادا کرنا پڑتا ہے۔ دنیا کی قدیم ترین تہذیب کے عجائب گھر میں یہ نہایت احسن بات تھی۔

گو مجھے آثار قدیمہ سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی ہے لیکن یہ مشہور عالم تاریخی کھنڈرات اپنے اندر بہت کشش رکھتے ہیں۔ ہمارے سامنے بڑی بڑی دیواریں تھیں اور ان کی اینٹوں کے سائز حیران کن حد تک بڑے تھے۔ ہر دیوار کے درمیان میں دروازہ تھا اور اسی سائز کی

دوسری دیوار اور دروازہ سے پہلے پچاس فٹ کا صحن تھا اور یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ دو تین دیواروں کے بعد ایک صحن میں کافی تعداد میں کرسیاں پڑی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں تھیٹر قائم ہے جہاں مختلف قسم کے تاریخی کھیل پیش کئے جاتے ہیں۔ ابھی کچھ دیواریں باقی تھیں مگر میں یکسانیت محسوس کر کے ان بلند و بالا دیواروں سے باہر آ گیا۔ پندرہ بیس فٹ کی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ہم ایک کھلے راستہ پر کھڑے تھے جہاں اینٹیں اور کہیں کہیں تارکول نظر آ رہی تھی۔ میوزیم کے گائیڈ نے بتایا کہ یہ چھ ہزار سال پرانی سڑک ہے جس پر بیس گھوڑے برابر میں دوڑ سکتے تھے اور یہ ''اوریجنل'' حالت میں ہے۔ مغرب میں ہمارے سامنے ایک شیر کا پتھر سے بنا مجسمہ تھا جس نے اپنے پنجوں سے ایک انسان کو دبوچ کر زمین پر گرا رکھا تھا۔

واپس مڑنے کے بعد جنوب مشرق میں ایک بڑا مگر بوسیدہ سا دروازہ تھا اس میں داخل ہوئے تو سامنے ایک چھوٹا کنواں تھا۔ اس کنواں کے بارے بتایا گیا ہے کہ یہاں دو فرشتے ہاروت و ماروت اللہ تعالیٰ کے حکم سے بطور سزا الٹے لٹکے ہوئے ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ کنویں میں جھانک کر دیکھا تو نیچے گدلا سا پانی نظر آیا۔ بعض حضرات کہہ رہے تھے ''فرشتے نظر نہیں آ رہے!'' دھوپ کافی تیز تھی اور کھنڈرات دیکھنے کے لئے ہمیں آدھ گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا۔ اونچی نیچی جگہوں پر آتے جاتے تھکاوٹ نے بھی واپسی پر مجبور کر دیا۔ بابل میں واقع تین ہزار سال قدیم اس تہذیب کو امریکی فوجیوں نے اپریل 2003ء میں عراق پر اپنا قبضہ مکمل ہونے کے بعد ''فوجی چھاؤنی'' میں تبدیل کر دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کھنڈرات سے ملحق صدر صدام حسین کے ایک عالی شان محل پر بھی قبضہ کر کے اسے اپنی رہائش گاہ بنا لیا تھا اور اس محل کو نقصان پہنچانے کے علاوہ یہاں سے قیمتی اشیاء بھی غائب کر دیں۔ امریکی فوجیوں نے عالمی ورثہ قرار پانے والے بابل کی تہذیب کے ان آثار کو اس انداز سے ''بلڈوز'' کیا کہ آثار قدیمہ کے ماہرین چیخ اُٹھے اور انہیں کہنا پڑا کہ اس قسم کی ''تہذیبی ڈاکہ زنی'' کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ امریکیوں نے بابل میں اپنا اڈہ بنانے کے

بعد یہاں کے میوزیم سے نادر قیمتی اشیاء غائب کر دیں اور بعد میں یہ بین الاقوامی مارکیٹ میں مبینہ طور پر فروخت کر کے لاکھوں ڈالرز کمائے گئے۔ ایک ماہ کے اندر میوزیم سے چوری ہونے والی نادر اشیاء کی تعداد 15000 تھی جن میں سے چند واپس لائی جا سکیں۔ 2500 غیر ملکی فوجیوں نے بابل میں اپنا کیمپ قائم کیا تھا اور امریکیوں نے 100 مربع میٹر جگہ کو ہموار کر کے یہاں ہیلی پیڈ تعمیر کیا۔ اس کارروائی سے قدیم دور کی اینٹیں اور بعض نادر نمونے ضائع ہوگئے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین نے غیر ملکی افواج خصوصاً امریکیوں کی اس تہذیبی دست برد اور لوٹ مار پر جب بین الاقوامی فورم پر سخت احتجاج کیا تو امریکہ نے ڈھٹائی سے اس کارروائی کا دفاع کرتے ہوئے اس وقت بیان دیا کہ انہوں نے یہ سب کچھ اس تہذیبی ورثہ کو لوٹ مار کرنے والوں سے بچانے کے لئے کیا۔ آثار قدیمہ کے ماہر ایک پروفیسر نے اس امریکی منطق کو رد کرتے ہوئے کہا تھا ''یہ تو ویت نام جیسی بات ہے کہ آپ بچانے کی غرض سے برباد کر دیں۔'' مرکزی گیٹ سے نکلتے ہوئے دائیں جانب ایک شاپ پر نظر پڑی تو وہاں عراق کے قابل دید مقامات کی تصاویر پر مبنی پوسٹر، ویو کارڈز، نقشے، کتابیں، بروشر اور ہاتھ کی بنی اشیاء موجود تھیں۔ دس پندرہ منٹ یہاں بھی لگ گئے۔ ان اشیاء کی قیمتیں بہت زیادہ تھیں۔ پھر بھی چند دوستوں نے کچھ نہ کچھ خرید لیا اور کارواں پھر سے چل پڑا۔

بابل سے 20 کلومیٹر کی مسافت پر سڑک سے 4 کلومیٹر دور دائیں جانب مغرب میں وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ دور سے یہ علاقہ میدان ہی نظر آتا ہے۔ جس زمانے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے ان دنوں یہاں نمرود کی بادشاہی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں اسی سمت تھوڑا آگے ایک قبرستان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت ابی بکر رضی اللہ عنہ کا مزار ہے جب کہ مشرقی جانب 91ء میں عراق پر اتحادیوں کی بمباری کے نتیجہ میں تباہ ہونے والی گاڑیوں اور مشینری وغیرہ کا ملبہ کھلے علاقہ میں پڑا تھا۔ ایک کلومیٹر مزید آگے بائیں ہاتھ بابل یونیورسٹی کی عمارت نظر آئی اور دس منٹ بعد بسیں سڑک سے تھوڑا دُور ایک چھوٹی سی بستی میں رک گئیں۔ اس جگہ کو ''حلہ'' کہتے ہیں یہاں حضرت ایوب علیہ السلام کا

مزار ہے۔ آپ علیہ السلام کا ''صبر'' بہت مشہور ہے۔ سادہ سی عمارت کے گرد کھجور کے درختوں کے جھنڈ ہیں چھوٹے سے کمرہ میں تعمیر قبر پر چپس لگی ہے۔ اِردگرد پائپ کا جنگلا اور اوپر سبز رنگ کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ فاتحہ خوانی کے بعد جیسے ہی باہر نکلے مقامی بچے اکٹھے ہو کر بخشیش اور فلوس (پیسے) مانگنے لگے مگر ہم جلدی جلدی بسوں میں سوار ہو گئے۔

بس میں کافی دیر بعد بشیر اعوان نے عارف سعید کو کہا کہ اس نے حضرت ایوب علیہ السلام کے مزار پر جو فلم تبدیل کرتے وقت کیمرے سے نکالی تھی مجھے واپس کرو۔ عارف سعید نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر فلم غائب تھی غالباً وہ تبدیل کرتے وقت مزار کے اندر ہی کہیں رہ گئی تھی۔ اس فلم میں بشیر اعوان کی کافی تصاویر تھیں خاص طور پر انہیں زیادہ افسوس ہوٹل کی ملازم لڑکیوں کے ساتھ اتاری گئیں فوٹوز کا تھا۔ اس پر ہم نے اسے تنگ بھی کیا اور افسوس بھی کہ واقعی اس کا تو بڑا نقصان ہو گیا اور بشیر صاحب خاموش اور اداس ہو کر بیٹھ گئے۔

مقام خضر.....قدیم ترین عبادت گاہ

دوپہر بارہ بجے ہم ایک چھوٹے سے شہر پہنچے۔ یہاں قابل دید تاریخی مقام ''مقام خضر'' تھا جسے دیکھنے کے لئے ایک چھت والے بازار سے گذر کر جانا پڑتا ہے۔ مقام خضر دراصل ایک قدیم ترین عبادت گاہ ہے اور یہاں حضرت ذوالکفل علیہ السلام کا مزار ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ کے 14ویں پیغمبر تھے۔ مزار پر لکڑی کا باکس ہے۔ اوپر قدیم طرز کا مگر منفرد گنبد ہے۔ دائیں جانب اصحاب النبی کی 5 قبریں ہیں جن پر سبز رنگ کی چادریں ہیں۔ ان اصحاب النبی علیہ السلام کے نام یاروخ، یوسف الربان، یوشع، خون ناقل التوراہ اور یوحنا الایملجی ہیں۔ پرشکوہ عمارت واقعی عظمت رفتہ کی غماز ہے۔ بوسیدگی اور زمانے کی شکست و ریخت کا شکار اس عمارت میں بے شمار محرابیں ہیں۔ دیواروں اور دروازوں پر نقاشی کے قدیم نمونے سیاہ پڑنے کے علاوہ کہیں کہیں سے اڑ چکے ہیں۔ دیواروں پر عبرانی زبان میں کتبے کندہ ہیں۔ مزار کی عمارت کے باہر یہودیوں کی دینی درسگاہ اور مکتبہ کے کھنڈرات ہیں۔ یہ یہودیوں کی تعمیر کردہ عمارت تھی جہاں ان کے بچے دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ عمارت میں اولین قبلہ بیت المقدس کی نشاندہی بھی ہے۔ صحن زیادہ بڑا نہیں ہے مگر اس کے چاروں طرف کمرے بنے ہوئے ہیں۔ مرکزی دروازہ کے عین سامنے کونے میں ایک بڑا مینار ہے جو کئی جگہ سے ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔

یہاں ایک دو تصاویر اتاری تھیں کہ میرے کیمرے میں فلم ختم ہوگئی۔ یہ دوسری فلم تھی جو بغداد میں ہمارے گائیڈ نے لاکر دی تھی۔ نجف کے لئے پھر سے رخت سفر باندھا اور دوپہر کا کھانا وہاں پہنچ کر کھایا۔ عراق کے ہوٹلز میں عورتیں اور مرد اکیلے کھانا کھاتے کم کم نظر آتے

ہیں زیادہ تر فیملیز یعنی مرد عورت اور بچے ہوتے ہیں۔ یہاں ہوٹل کافی بڑا تھا اوپر والی منزل پر ہمیں ٹیبل دیئے گئے اور ہم نے کباب اور روٹی کے علاوہ لوبیہ قسم کی دال کھائی۔ ان کھانوں کا ذائقہ زیادہ اجنبی محسوس نہیں ہوا۔ روٹی ختم ہونے پر راشد ''محمد'' کہہ کر بلاتا تو کوئی نہ کوئی ویٹر آ جاتا گو ان کا نام کوئی اور ہوتا مگر وہ اسی نام سے متوجہ ہو جاتے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ عراق اور ایران میں اکثریت کے نام محمد، حسن، حسین، علی، اسماعیل وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مزار پر حاضری

ہوٹل سے ہم کھانا کھا کر نکلے تو وہاں سے دس منٹ کی پیدل مسافت پر سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مزار انور تھا مگر اس سے پہلے واقع دکانوں سے عارف، راشد اور بشیر اعوان نے تگ، موتی اور عقیق خریدنے شروع کر دیئے۔ مجھے چونکہ ان پتھروں کے اصل نقل ہونے اور فوائد کا علم وشغف نہیں تھا اس لئے خاموشی سے یہ خرید وفروخت دیکھتا رہا۔ نماز ظہر ہم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مزار سے ملحقہ مسجد میں ادا کی اور اولین حاضری و فاتحہ کے بعد پروگرام کے مطابق ہوٹل ''زم زم'' جو نجف میں واقع فورسٹار ہوٹلز میں سے ایک ہے پہنچے۔ دوسری منزل پر واقع کمرے کی چابی لے کر ہم نے سامان رکھا۔ نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کوفہ جو نجف کے مرکز سے 10 کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے کے لئے چل پڑے۔ کوفہ شہر جسے عربی میں ''الکوفہ'' کہتے ہیں کو اسلامی تاریخ میں بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس شہر کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے 638ء (17ھ) میں آباد کیا تھا۔ کوفہ شہر کو بعد میں چوتھے خلیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے 657ء (36ھ) میں اسلامی ریاست کا دارالخلافہ بنا لیا تھا۔ جہاں ہم بس سے اُترے وہاں ہمارے سامنے بہت بڑی فصیل میں ایک شاہی قلعہ طرز کا قدیم دروازہ تھا۔ یہ کوفہ کی جامع مسجد ہے جس میں داخلہ کے لیے شمالی دروازہ استعمال ہوتا ہے۔ کوفہ کی جامع مسجد عراق میں جامع مسجد بصرہ کے بعد دوسری سب سے بڑی مسجد ہے۔ موجودہ جامع مسجد کوفہ شہر کی سب سے بڑی مسجد کی جگہ پر تعمیر کی گئی ہے جسے قدیم مسجد کی طرز پر ہی تعمیر کیا گیا ہے اور قدیم عمارت کو 28 سیمی سرکلر ٹاورز کی مدد سے قائم کیا گیا ہے۔ مسجد میں متعدد کوریڈار اور گنبد ہیں۔ ایک گنبد عین اس جگہ ہے جہاں فجر کی نماز کے دوران ایک بدبخت عبدالرحمٰن ابن ملجم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خنجر سے شدید زخمی کیا تھا اور آپؓ نے دو روز موت وحیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ مسجد کے اندر اس محراب کو محفوظ کیا گیا ہے اور سونے

چاندی سے نقاشی کے فن کا خوبصورت مظاہرہ یہاں نظر آتا ہے۔

حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ، مختار سکشی رضی اللہ عنہ، (جو کربلا میں شہید ہوئے) صحابی رسول ﷺ حضرت ہانی بن عروہ رضی اللہ عنہ (جنہوں نے حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو پناہ دی تھی) اور خدیجہ بنت علی رضی اللہ عنہا کے مزارات بھی مسجد کے احاطہ میں واقع ہیں۔ مختار سکشی رضی اللہ عنہ کی قبر حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کے مزار کے اندر ایک کونہ میں واقع ہے۔ ان مزارات پر بڑے بڑے اور خوبصورت گنبد ہیں اور حضرت ہانی بن عروہ رضی اللہ عنہ کے مزار کی تعمیر نو اور تزئین و آرائش جاری تھی۔ ان تمام مزارات پر حاضری اور فاتحہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ مسجد کے احاطہ میں ایک گنبد ''ہاؤس آف گورنمنٹ'' کی عمارت کے اوپر ہے جو عباسی اور اموی دورِ خلافت میں حکومتی نظم ونسق کا مرکز تھا۔ مسجد کے وسیع کچے صحن میں ایک جگہ گولائی میں لوہے کی چند چھوٹی سلاخیں ہیں۔ ان کے متعلق بتایا گیا کہ یہ وہی تندور ہے جہاں سے طوفان نوح علیہ السلام برآمد ہوا تھا۔ گہرائی تو بالکل نہیں البتہ لوہے کی سلاخیں ہی نشاندہی کرتی ہیں۔ مسجد میں سب نے باجماعت نماز عصر ادا کی اور مسجد کے جنوب میں بالکل ساتھ واقع بیت المشرف (حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا گھر) میں زیارت کے لئے داخل ہوئے۔ کچی دیواروں اور چند کمروں کا یہ گھر اس دور کا ہے جب کوفہ کا گورنر بننے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہاں سکونت اختیار کی۔ نواسۂ رسول ﷺ حضرت امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما نے یہیں پرورش پائی تھی۔ دروازہ سے اندر داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں جن پر بیت العائلہ، محل الکفن اور غسل کی جگہ کی تختیاں لگی ہیں۔ آگے جا کر ایک چھوٹا سا کنواں ہے جس سے ایک سرکاری خادم پانی نکال کر زائرین کو پلا رہا تھا جب کہ متعدد حضرات تبرک سمجھ کر ساتھ لے جانے کے لئے پلاسٹک کی بوتلوں میں پانی بھرتے رہے اور خادم کو بخشیش بھی دیتے رہے۔ ان کمروں سے واپس باہر نکلے تو سامنے چھوٹا سا کمرہ ہے اس پر مکتبہ حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی تختی لگی ہے اندر چند کتب رکھی ہیں اور کوئی چیز نہیں۔ بیت المشرف کے ہٹے کٹے سرکاری خادمین خاصے بدتمیز واقع ہوئے کیوں کہ وہ بازو سے پکڑ پکڑ کر بخشیش مانگتے تھے۔ اہل کوفہ کو بے وفا تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ انہوں نے امام عالی مقام حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے بے وفائی کا ثبوت دیا تھا۔

کوفہ کے چور

کوفہ کی سڑکیں اور بازار کافی کھلے اور عورتوں کا خاصا رش نظر آیا۔ جن کے قد دیگر عراقی علاقوں کی عورتوں کی نسبت دراز تھے اور اس علاقہ میں عورتیں سیاہ رنگ کی چادر برقعہ میں تھیں۔ زیادہ تر عورتوں کے چہرے سپاٹ اور کرخت تھے۔ جامع مسجد کوفہ کے دروازہ کے سامنے بیکری کی دکانیں تھیں جن سے خریداری کے لئے ہمارے ساتھ موجود کراچی کے افضالی بابا نے کیک رس کا بھاؤ پوچھا تو دکاندار کے دام سن کر وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئے۔ ہم نے پوچھا کیا ہوا؟ کہنے لگے ''یہ تو چور ہیں اس قدر مہنگائی تو پورے عراق میں نہیں ہے''۔ شام سے ذرا پہلے کوفہ سے واپس چلے تو شہر میں ایک جگہ بس روک کر ہمیں بتایا گیا کہ یہ ''مسجد حنانا'' ہے اور کربلا میں شہید کرنے کے بعد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا تن سے جدا کیا ہوا سر کچھ دیر کے لئے یہاں رکھا گیا تھا۔ مسجد کا دروازہ بند تھا اور اس کا گنبد بہت نمایاں نظر آتا تھا۔

نجف پہنچنے کے بعد سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مزار پر دوبارہ جا کر رکے۔ شام کے بعد مزار کے احاطہ میں خواتین اور بچوں کا خاصا رش نظر آیا۔ احاطہ کی فصیل نما دیوار کے باہر ملنگ خواتین وحضرات کے ڈیرے تھے۔

شہادت کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جائے تدفین سے متعلق مختلف روایات ہیں اور گیارہ مختلف جگہوں پر آپ رضی اللہ عنہ کے جسد خاکی کا بیان کیا جاتا ہے۔ افغانستان میں مزار شریف نام کی جگہ پر آپ رضی اللہ عنہ کی آخری آرام گاہ بتائی جاتی ہے جہاں نہایت عالی شان عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ اس کے شام وغیرہ میں آپ رضی اللہ عنہ کی تدفین کا بتایا جاتا ہے لیکن محققین کے مطابق نجف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک سب سے پہلے داؤد بن علی العباس نے 750ء (139ھ) میں دریافت کی۔ اس کے بعد عباسی خلیفہ ہارون رشید نے نجف کے

علاقہ میں شکار کھیلنے کے دوران ''القوات'' نامی جگہ جو تین پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی ہے رک کر 786ء (170ھ) کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر کی نشاندہی کی اور یہ وہی جگہ ہے جہاں آج آپ رضی اللہ عنہ کا عالی شان مزار مرجع خلائق ہے۔ سب سے پہلے خلیفہ ہارون رشید نے مزار پر سرخ رنگ کی مٹی کی اینٹوں کا گنبد تعمیر کروایا اس کے بعد آنے والے خلفاء اور امراء نے مزار کی عمارت کو آپ رضی اللہ عنہ کی ہستی کے شایانِ شان بنانے کے لئے خوبصورت تعمیرات کرائیں۔ آج مزار کے گنبد، میناروں اور دیگر جگہوں پر تزئین و آرائش کے لئے منوں کے حساب سے سونے کا استعمال نظر آتا ہے۔ مرکزی عمارت کے چاروں طرف بڑے بڑے دروازے ہیں جن میں سے سامنے، بائیں اور پیچھے والے دروازے احاطہ میں داخل ہونے کے لئے زیادہ استعمال ہوتے ہیں جب کہ دائیں جانب سڑک پر کھلنے والا دروازہ بند رہتا ہے۔

مزار سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اندر تصاویر اتارنے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف فلیش کے بغیر کیمرہ سے یہ ممکن تھا لیکن اندر بے پناہ رش کی وجہ سے موقعہ نہیں ملتا کہ اچھی تصویر بنائی جائے۔ ہمارے یہاں قیام کے دوران وقفے وقفے سے لکڑی کے تابوت میں تین چار میتیں لائیں گئیں۔ جن میں سے ہر ایک کو دو نوجوان آگے پیچھے اپنے کندھوں پر اٹھا کر قبر کے گرد چار چکر لگاتے اور اس کے بعد تابوت صحن میں مزار کے اندرونی مرکزی دروازے کے سامنے رکھ کر ایک سرکاری خادم کے حلیہ میں مولانا خاصی دیر کچھ زیرلب اور کچھ بلند آواز میں پڑھتے۔ بعد میں لواحقین تابوت اٹھا کر باہر پارکنگ میں کھڑی گاڑی میں رکھ کر چلے جاتے۔

مزار کے احاطہ کے باہر بائیں جانب اور سامنے بڑا بازار تھا جہاں ہر قسم کی اشیاء کی دکانیں تھیں۔ ہمارے ساتھیوں عارف سعید اور بشیر اعوان نے تو یہاں سے سینکڑوں کے حساب سے تسبیحات جو پلاسٹک کی بنی تھیں خرید ڈالیں۔ میرے کیمرہ میں فلم ختم ہو چکی تھی اور میں نئی فلم خریدنا چاہتا تھا اس مقصد کے لئے بازار میں ہم کافی دُور تک چلتے گئے۔ یہاں جتنے بھی فوٹو سٹوڈیو تھے وہ بالائی منزل پر واقع تھے اور گول سیڑھیاں چڑھ کر سٹوڈیو تک جانا پڑتا تھا۔ ایک جگہ ہم تنگ سے ذیلی بازار میں اوپر سٹوڈیو میں گئے تو وہ صاحب تھوڑی بہت

انگریزی جانتے تھے۔ انہوں نے ہمیں ''آروو'' کمپنی کی کلر فلم دی اور چار ہزار دینار بتائے۔ رقم ادا کرنے کے دوران دکاندار سے انگریزی میں مختصر گفتگو ہوئی تو اس نے کہا ''آپ انگریزی بہت اچھی بولتے ہیں''۔ شکریہ کہہ کر ہم فلم لے کر نیچے اُتر آئے اور دوبارہ مزار کے قریب آ کر تبدیل کرنے سے پہلے ''ایکسپائری ڈیٹ'' دیکھی تو وہ کب کی ختم ہو چکی تھی۔ تھوڑی سی پریشانی ہوئی اور افسوس بھی کہ اسی وقت ڈیٹ کیوں نہیں دیکھی۔ میں اور قاسم جلدی جلدی سٹوڈیو والا ذیلی بازار ڈھونڈ کر سیڑھیوں سے اوپر گئے تو آگے سے دروازہ مقفل تھا یعنی وہ دکان بند کر کے جا چکا تھا۔ خیر اب کیا ہو سکتا تھا اسی فلم سے تصاویر اتارنے کا ''رسک'' لے لیا کیوں کہ اس قسم کی فلم سے تصاویر میں پیلا اور سرخ رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

عشاء تک ہم مزار سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اندر اور آس پاس رہے۔ بعد میں پیدل اس چوک میں آئے جہاں دوپہر کے کھانے والا ہوٹل واقع تھا۔ اسی میں رات کھانے کے لئے تمام حضرات پہنچ چکے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد حسب طلب حضرات نے باہر چائے پی جب کہ میں نے اور ایک دوست نے سیون اپ کی طرز کی بوتل پی اور گاڑیاں ہمیں ہوٹل لے گئیں جہاں لیٹتے ہی نیند نے آ لیا۔

کربلا کا سفر

صبح 8 بجے مزار سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر الوداعی حاضری اور فاتحہ کی سعادت کے بعد ہم نے کربلا کے لیے رختِ سفر باندھا۔ نجف سے کربلا کا فاصلہ 78 کلومیٹر ہے جب کہ ایک اور سڑک کے ذریعے بغداد اور کربلا کا درمیان فاصلہ 102 کلومیٹر ہے۔ نجف کے مرکزی قبرستان پہنچے تو تاحد نگاہ قبریں ہی قبریں نظر آئیں۔ بہت بڑا قبرستان تھا۔ ویسے دنیا کا سب سے بڑا قبرستان تو ''مکلی'' سندھ (پاکستان) میں ہے جس کا رقبہ 600 مربع میل یعنی 1900 ایکٹر ہے اور قبروں کا شہر احمد آباد (بھارت) کو کہتے ہیں۔ اس قبرستان میں دو انبیاء کرام حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کے مزارات ہیں جن پر حاضری اور فاتحہ کے لئے سڑک سے کافی دور قبرستان میں چل کر جانا پڑا۔ مزارات سادہ سے ہیں۔ اِردگرد زیادہ تر قبریں نوجوانوں کی تھیں جو جنگوں میں جاں بحق ہوئے اکثر قبروں پر تصاویر بھی رکھی ہوئی تھیں۔

کربلا کے راستہ میں پہلا مزار حضرت حر رضی اللہ عنہ کا ہے۔ جو کربلا کے معرکہ حق و باطل میں میدان میں عین لڑائی کے وقت امام عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے آ ملے تھے۔ سڑک کے دائیں جانب مزار کی نمایاں عمارت ہے اور صحن میں کھجور کا درخت ان دنوں پھل سے لدا ہوا تھا۔ تزئین و آرائش اچھی خاصی ہے اور عمارت کا اندرونی حصہ خاصا روشن تھا۔ آدھ گھنٹے یہاں قیام کے دوران فاتحہ خوانی کی اور چونکہ ہمیں شام سے پہلے کربلا سے واپس آنا تھا اس لئے بلا تاخیر کربلا کی طرف سفر جاری رکھا۔ کربلا کی سرزمین پر ہم عین اس وقت پہنچے جب سورج اپنی پوری تاب پر تھا۔ شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہمارے چاروں طرف تاحد نظر کھجور کے باغات پھل سے لدے ہوئے نظر آئے۔ بسیں موڑ کاٹتی ہوئیں شہر کے مرکز میں

ایک بازار میں رکیں تو ہمیں نیچے اترنے کے لئے کہا گیا۔ نیچے اترے تو سامنے حضرت عباس علمدار رضی اللہ عنہ کا مزار نظر آیا اور گرمی کی شدت کا بھی احساس ہوا۔ واقعی کربلا کی سرزمین پر گرمی کا زور باقی شہروں کی نسبت زیادہ تھا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مزار کے سامنے سے گذر کر دائیں جانب دیکھا تو امام عالی مقام حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے مزار کی پرشکوہ عمارت تھی۔ مزارات کے درمیان میں کوئی 300 میٹر کا فاصلہ ہے اور اردگرد تمام دکانیں اور تجاوزات حال ہی میں گرا کر پارکنگ اور پارک وغیرہ بنانے کے لئے کام ہو رہا تھا۔

دوپہر کا وقت اور دھوپ کی شدت ناقابل برداشت تھی۔ ہم سیدھے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے مزار پہنچے۔ وسیع وعریض عمارت میں ہر طرف خواتین وحضرات اور بچے موجود تھے۔ عراق کے دیگر مزارات کی نسبت یہاں فقیروں کی تعداد خاصی کم تھی۔ تمام حضرات باوضو مزار کے اندر جمع ہوئے۔ رش کی وجہ سے مزار کے سرکاری خادم اندھے بیٹھنے پر معترض تھے مگر ہمارے ساتھ موجود جامعہ صدام کے طالب علم عظمت نے انہیں عربی میں بتایا کہ یہ لوگ پاکستان سے آئے ہیں اور امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کو نذرانہ عقیدت کے لئے اندر کچھ دیر کے لئے اکٹھے بیٹھنا چاہتے ہیں۔ عظمت نے خود اور علامہ اللہ بخش چشتی نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی سیرت وکردار، عظمت اور اسلام کے لئے بے مثال قربانیوں کا خصوصیت سے ذکر کیا اور اس نشست کو آدھ گھنٹہ ہو چلا تھا کہ سرکاری خادموں نے اشاروں سے کہنا شروع کر دیا کہ اجتماع ختم کریں۔ دعا کے ساتھ سب حضرات مزار کے دیگر حصوں کی زیارت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مشرق کی طرف مرکزی دروازہ کے ساتھ ہی بائیں جانب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے 120 جانثاروں کے ناموں کی خوبصورت تختی لگی ہے جو یہاں دفن ہیں۔ سب سے پہلے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا مزار 685ء (65ھ) میں تعمیر کیا گیا جب کہ دو صدیوں بعد 861ء (247ھ) میں عباسی خلیفہ مستنصر باللہ نے یہ مزار از سرنو تعمیر کرایا اور چار دیواری الحسن بن الفضل نے تعمیر کروائی تھی۔

جنوب میں مزار کے اندر داخلہ کا جو دروازہ ہے اس کے بائیں جانب چھوٹا سا دروازہ

ہے اور نیچے اترائی میں واقع جگہ کے بارے کہا جاتا ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اس مقام پر شہید ہوئے تھے اور اس جگہ ایک خاص قسم کا سنگ مرمر چاروں طرف لگایا گیا ہے جس سے بکھرے خون اور اس کے دھبوں کا گمان ہوتا ہے۔ حسن اتفاق یہ کہ جب میں اور کچھ دوست وہاں گئے تو اس جگہ کا دروازہ کھلا تھا اور ہم نے اندر جا کر اس جگہ کی زیارت کی۔ تھوڑی دیر بعد آنے والے حضرات اس سے محروم رہ گئے کیوں کہ وہاں تعمیر و مرمت کا کام بھی ہو رہا تھا اس لئے یہ دروازہ بند کر دیا گیا۔ مزار کی عمارت کے اندر ہی پچھلی طرف شمال مغرب میں حضرت السید ابراہیم المجابؒ کا مزار ہے جو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے مقامی خادم تھے۔ اسی طرح ایک اور خادم شہید حبیب بن مظاہر الاسدیؒ کا مزار بیرونی برآمدہ میں ہے۔ پوری عمارت میں خطاطی اور آرٹ کا دلکش اور حیرت انگیز مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ روح پرور ماحول اور ایمان افروز کیفیت میں بھی آج سے ہزاروں سال قبل کربلا کے اسی میدان میں 680ء (10 محرم 61ھ) میں ہونے والے معرکہ حق و باطل کا نقشہ ذہن میں گھوم جاتا ہے کہ امام عالی مقام اور اہل بیت رضی اللہ عنہم پر مظالم کی انتہاء کرنے والوں کا نام و نشان مٹ چکا ہے اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا نام ان کی جرأت، شجاعت اور صبر و استقلال آج بھی پوری آب و تاب سے زندہ ہے اور متلاشیانِ حق کے لئے رہتی دُنیا تک باعث تقلید رہے گا۔

جب بغاوت کچلی گئی

حضرت امام حسینؓ کے مزار کے جنوب میں جو دروازہ ہے وہاں بڑی تعداد میں سنگ مرمر کے ٹکڑوں میں سوراخ اور مرمت کے نشان نظر آئے۔ تجسس اور استفسار پر پتہ چلا کہ 1991ء میں اتحادیوں کے عراق کے شہروں پر حملوں اور جنگ بندی کے بعد اس علاقہ میں شیعہ آبادی نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی تھی جسے کچلنے کے لئے سرکاری فوج نے ہیلی کاپٹروں کے ذریعے کارروائی کی اور لوگوں پر گولیاں برسائیں۔ حملوں سے بچنے اور جان بچا کر بھاگنے والے بڑی تعداد میں پناہ کی غرض سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے مزار میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے اندر سے دروازے بند کر لئے مگر سرکاری فوجیوں نے ان کا پیچھا کیا اور مزار کے اندر داخل ہو کر گولیاں برسائیں جس سے بے شمار لوگ مارے گئے۔ فوج کی اس خون ریز کارروائی کے دوران مزار کے تاریخی دروازہ کو خاصا نقصان پہنچا اور دیواروں پر جا بجا گولیوں کے نشانات اندھا دھند فائرنگ کے شواہد تھے۔ بعد میں ان نشانات کو سنگ مرمر کے نئے ٹکڑے لگا کر مرمت کی کوشش کی گئی ہے مگر اس کے باوجود فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں کچھ ہوا ہے۔

مزار کی عمارت کے باہر پچھلی جانب ایک گنبد والا کمرہ ہے جو اونچائی میں ہے اس سے متعلق ہمیں بتایا گیا کہ یہ وہ چبوترہ ہے جہاں سے حضرت بی زینب رضی اللہ عنہا جنگ کا منظر دیکھتی تھیں۔ جنوب میں کچھ فاصلے پر ایک حویلی ہے جس کا بیرونی دروازہ خاصا بلند ہے اور اندر معرکہ کربلا میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کے افراد کے خیموں کی جگہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ چبوترے سے میدانِ جنگ کا منظر دیکھ کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا ان خیموں میں خبر لاتی تھیں۔ یہاں بھی خادمین زبردستی بخشیش مانگتے نظر آئے۔ باہر اِردگرد خاک کربلا

سے بنی تسبیحات، مختلف آیات پر مبنی کپڑوں اور کفن وغیرہ کی متعدد دکانیں تھیں۔ احباب نے جلدی جلدی یہاں کچھ خریداری کی اور ہم چند دوست افضالی بابا کے ساتھ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مزار میں داخل ہوگئے۔ جوتے وغیرہ جمع کروائے اور وسیع و عریض عمارت میں چلتے ہوئے اس جگہ آ کر بیٹھ گئے جہاں حضرت عباس رضی اللہ عنہ آسودہ خاک ہیں۔

فاتحہ خوانی کے بعد افضالی بابا نے کہا ''بیٹھ جاؤ''۔ افضالی بابا 60 سال عمر، دراز قد، لمبی داڑھی، گلے میں موٹے دانے کی تسبیح، ماتھے پر محراب، ہاتھوں میں پتھروں لگی متعدد انگوٹھیاں، گلے میں ہلکے زرد رنگ کا کرتہ، چیکدار چادر پہننے اور سر پر گول ٹوپی رکھے بارعب شخصیت نظر آتے تھے اور ان کی گرجدار آواز سونے پر سہاگہ تھی۔ بابا نے 15 سے زائد حج اور اتنے ہی عمرے کر رکھے تھے جو ان کے عقیدت مندوں نے کروائے تھے اور ہر دعا میں پھر سے بیت اللہ اور مسجد نبوی پر حاضری کی دعائیں شدت سے مانگتے تھے۔ مجھے ان کی دعا بہت لطف دیتی تھی اور واقعی وہ خوبصورت اور پُراثر دُعا مانگنے میں قدرت رکھتے تھے۔ ہم بیٹھ گئے تو ان کے پاس کھانے پینے کی کچھ چیزیں تھیں جنہیں سامنے رکھ کر انہوں نے ''ختم شریف'' شروع کر دیا اور پُراثر دعا مانگی۔ پھر یہ تبرک نہ صرف ہمارے درمیان تقسیم کیا بلکہ مزار پر حاضری دینے والے مقامی بچوں اور عورتوں کو بھی انہوں نے بلا بلا کر تقسیم کیا۔ باہر کی گرمی کے مقابلہ میں مزار کے اندر کے پُرکیف اور اُجلے اُجلے ماحول میں اس قدر سکون تھا کہ باہر جانے کو دل ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ اتنے میں دیگر حضرات بھی آ گئے اور باجماعت نماز ظہر ادا کرنے کے بعد باہر آ گئے کہ ہماری روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ باہر آ کر پیٹ کی آگ بجھانے کا سامان ڈھونڈنے لگے۔ وہی کباب پھر نظر آئے جو بغداد، سامرہ، نجف اور دیگر جگہوں پر تھے مگر یہاں کھانے کے دوران ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ کربلا کی گرمی نے بسوں میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا اور تھوڑی دیر بعد ہم بغداد واپسی کے لئے محوِ سفر تھے۔ اِردگرد کھجوروں کے باغات میں دو رنگ کے کوے نظر آئے تو حیرت ہوئی۔ کوے عراق میں دو رنگوں میں پائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کوا سفید نہیں ہو سکتا مگر یہاں خود اپنی آنکھوں سے پہلے بغداد اور پھر کربلا میں ایسے

کوے دیکھے جن کا اوپر کا حصہ کالا اور نیچے پیٹ والا حصہ سفید تھا۔

کربلا سے 20 کلومیٹر کے فاصلہ پر بغداد روڈ پر سڑک کے دائیں جانب حضرت عون بن عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ کا مزار ہے۔ قبر چھوٹے سے کمرہ میں ہے جس کے سامنے برآمدہ ہے۔ ہم فاتحہ کے لئے اندر گئے تو قبر کے سر کی جانب جالیوں کے ساتھ رسی کی مدد سے ایک جوان لڑکی کے ہاتھ بندھے جس نے سیاہ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور وہ دھیمی آواز میں آہ و بکا بھی کر رہی تھی۔ ایک دو عورتیں اس کے پاس کھڑی تھیں اور غالباً اسے چپ رہنے کا کہہ رہی تھیں۔

50 کلومیٹر پر حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد اور مسلم رضی اللہ عنہما کے مزارات ہیں۔ وسیع چاردیواری میں بڑے گنبد پر سبز رنگ کے ٹائیلز، باہر بڑا گیٹ اور نقاشی ہوئی ہے۔ اِردگرد چھوٹی سی بستی بھی موجود ہے۔

جامعہ صدام کے طلباء سے ملاقات

عصر کے وقت ہم بخیریت بغداد پہنچ گئے۔ نماز عصر مزار غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے ملحقہ مسجد میں ادا کی۔ یہاں جامعہ صدام کے بھارتی اور سری لنکن طلباء سے ملاقات ہوئی۔ جامعہ صدام میں ہر سال پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور سری لنکا سے دو دو طلباء کو وظیفہ پر داخلہ دیا جاتا ہے۔ جو یہاں درس نظامی کی طرز پر قرآن وحدیث، فقہ، صرف ونحو وغیرہ کی تعلیم عربی زبان میں حاصل کرتے ہیں۔ یہ طلباء مزار غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی لائبریری کے نیچے بنے ایک کمرہ میں اکٹھے ہوتے ہیں جو صرف ان کے لئے مخصوص ہے۔ کمرہ میں بیٹھے ہوئے میں نے ان سے پوچھا ''میں نے سنا ہے کہ عراق میں مساجد میں اذان پہلے سے ریکارڈڈ چلائی جاتی ہے؟'' امرتسر کے ایک طالب علم نے حیرت سے کہا ''ایسا کیسے ممکن ہے جب ایسا ہوا قیامت نہ آ جائے گی۔'' اس نے بتایا کہ یہاں باقاعدہ مؤذن ہے جو ایک بند جگہ پر کھڑے ہو کر اذان دیتا ہے۔ ریکارڈڈ اذان والی بات غلط ہے۔ ممبئی سے تعلق رکھنے والے طالب علم تاج دین سے میں نے پوچھا کہ وہ یہاں جامعہ صدام میں کون سے خاص علوم پڑھتے ہیں جو پاکستان یا بھارت کے مدرسوں میں نہیں پڑھائے جاتے؟ اس نے کہا کہ یہاں اور وہاں کے نصاب میں کوئی زیادہ فرق نہیں مگر چونکہ نصاب کی تمام مسند کتب عربی زبان میں ہیں اس لئے ہمیں تمام مضامین عربی میں اصل روح کے ساتھ پڑھنے کا موقع ملتا ہے اور پھر پاکستان کی نسبت یہاں کا نصاب وسیع ہے۔ تاج دین نے بتایا کہ یہاں عراق میں ہمارے اساتذہ میں سے کوئی بھی اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلویؒ کی دینی خدمات کے بارے میں واقف نہیں تھا۔ ہم نے انہیں ان کے علم اور تصانیف کے بارے میں بتایا تو وہ حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ وہ تصانیف ہمیں ضرور دو۔ اس نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ مولانا احمد رضا بریلویؒ کی

تصانیف کا عربی میں ترجمہ ملتا ہی نہیں تھا۔ اسے پتہ چلا کہ لاہور میں مولانا عبدالحکیم شرف قادری نے ان کی تصانیف کا عربی میں ترجمہ کیا ہے تو انہوں نے یہ کتب منگوائیں اور اپنے اساتذہ کو دیں۔ پڑھنے کے بعد انہوں نے کہا کہ مولانا احمد رضا، امام غزالی کے مرتبہ کے عالم فاضل ہیں۔ تاج دین کا کہنا تھا کہ برصغیر کے بیشتر جید علماء اور مفسرین ومحققین کی علمی اور دینی خدمات کے بارے میں عراق کے اساتذہ بے خبر ہیں اور ضرورت اس امر کی ہے کہ یہاں ان کا تعارف کروانے کا اہتمام کتابی ومجلسی کسی بھی شکل میں ضرور ہونا چاہیے۔

عشاء تک وقت ان طلباء کے درمیان گذارا اور نماز کے بعد جیب میں موجود رقم جو دیناروں کی شکل میں تھی سوائے ایک ہزار دینار کے جو 250 کے چار نوٹ تھے فقیروں اور مساکین میں بانٹ دی کیوں کہ اب ان کے خرچ ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ فضول خرچی کی عادت مجھے پہلے ہی نہیں تھی اور پھر عراق سے میں نے کوئی شاپنگ نہیں کی اور نہ ہی پروگرام تھا۔ اس لئے 50 ڈالرز کے بدلے جو دینار ملے تھے ان میں ہی ہفتہ گذار دیا اور زیادہ تر اخراجات کھانے اور کیمرہ فلم خریدنے پر ہوئے یا پھر مانگنے والوں کو دیئے۔

الوداعی ڈنر

میزبان ٹریول ایجنٹ کی طرف سے ہمارے اعزاز میں الوداعی ڈنر تھا۔ رات 10 بجے ہمیں دریائے دجلہ کے کنارے واقع ایک ہوٹل میں لے جایا گیا جہاں دریا سے پکڑی گئی تازہ مچھلی کھلانے کا اہتمام تھا۔ ابھی مچھلی تیار ہو رہی تھی جب ہم میز کرسیوں پر جا بیٹھے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ اور دریا کے کنارے قطار میں اسی قسم کے کافی ہوٹل تھے۔ ہمارے سامنے میزوں پر سلاد لا کر رکھا گیا جو ہم باتوں باتوں میں چٹ کر گئے۔ مچھلی تیار ہو کر آنے کا ہم انتظار کر رہے تھے کہ پینٹ شرٹ میں ایک عراقی وہاں آ گیا اور ہمارے منتظمین میں سے ایک کو کہا کہ وہ اپنا کیمرہ بیچنا چاہتا ہے جو اس نے گلے میں لٹکا رکھا تھا۔ اس نے انکار کیا تو وہ ہماری ٹیبل کے قریب آ گیا۔ میں نے پوچھا ''کیا بات ہے؟'' اس نے کہا'' کیمرہ خریدو گے؟''

میں نے پوچھا'' کتنے کا ہے؟''

بولا''60 ڈالرز لوں گا''۔

میں نے کہا''یہ زیادہ ہیں''۔

وہ بولا''آپ کتنے دیں گے؟''

میں نے پاس بیٹھے راشد سے مشورہ کیا اور کہا کہ''30 ڈالرز''۔

عراقی نے کہا''نہیں 40 ڈالرز''۔

میں نے کہا''میں تو 30 ڈالرز ہی دوں گا''۔

وہ بولا''ٹھیک ہے''۔

میں اس میں سے اپنی فلم نکال کر ابھی لے آتا ہوں اور اس دوران اس نے کیمرے کی

کارکردگی واضح کرنے کے لئے ایک پرنٹ بھی ہمیں دکھایا۔ ادھر میں نے حساب لگایا کہ 30 ڈالرز میں کیمرہ مہنگا نہیں کیوں کہ یہ فوکس والا کیمرہ معہ فلش تھا۔ وہ فلم نکالنے چلا گیا اور میں بس میں رکھے اپنے بریف کیس سے ڈالرز نکال کر لے آیا۔ ٹیبل پر پہنچا تو راشد نے کہا ''تم خواہ مخواہ کیمرہ خرید رہے ہو، تمہارا اپنا جو ہے۔ پتہ نہیں یہ کیمرہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ اگر ٹھیک ہوتا تو عراقی کیوں بیچتا؟'' راشد نے دلیل دی۔

عارف سعید نے کہا کہ حق نواز بتا رہا تھا کہ کیمرے والا آدمی ''انٹیلی جنس'' کا بھی ہوسکتا ہے اور فراڈیا بھی لہٰذا اس سے بچ کر رہیں۔ اس بات نے مجھے پریشان کر دیا اور ایک دم مجھے خیال آیا کہ میرے پاس موجود کیمرہ کا اندراج عراقی حکام نے پاسپورٹ پر کیا ہے اور ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ عراقی حکام ملک سے الیکٹرونکس کا سامان باہر نہیں لے جانے دیتے جن میں کیمرہ بھی شامل ہے۔ واپسی پر اگر میرے پاس یہ کیمرہ چیکنگ کے دوران برآمد ہو گیا وہ لوگ ضبط کر لیں گے۔ یہ خیال آتے ہی میرا ارادہ بدل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آدمی آن پہنچا اور کہا ''یہ لو کیمرہ اور لاؤ ڈالرز''۔ میں نے ہاتھ کے اشارہ سے انکار کرتے ہوئے کہا ''میں نہیں لینا چاہتا''۔ وہ آدمی ہکا بکا رہ گیا کہ ابھی تو سودا طے ہوا ہے۔ پھر وہ میرے ہی کہنے پر فلم بھی نکال کر باقی فلم رول ضائع کر چکا تھا۔ شرمساری تو مجھے بھی تھی اور میں اس آدمی سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔ میں نے حق نواز کو بلایا اور کہا کہ یہ آدمی گلے پڑ گیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ کیمرہ خریدو، آپ اسے عربی میں سمجھا کر چلتا کرو۔ اس نے آدمی کو سمجھایا کہ ہم کیمرہ نہیں خرید سکتے مہربانی فرما کر وہ یہاں سے چلا جائے ہم نے کھانا کھانا ہے۔ بادل نخواستہ وہ شخص ہوٹل سے باہر جا رہا تھا اور بڑبڑاتے ہوئے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا تھا جب کہ میں کنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ باہر گیا میں نے سکون کا سانس لیا کہ ''بلا ٹلی'' اور ڈالرز ضائع ہونے سے بچ گئے۔

مچھلی تیار ہو کر ایک بڑی پلیٹ میں ہمارے سامنے آ چکی تھی اور ساتھ روٹی بھی۔ روٹی سے پہلا لقمہ لیا تو سارے اندازے دھرے کے دھرے رہ گئے کہ یہاں پکنے والی دیگر اشیاء کی طرح مچھلی کا مزہ شاید ہمارے مزاج کے مطابق نہ ہوگا۔ مچھلی انتہائی مزیدار تھی۔ جسے

درمیان سے کاٹ کر ایک ہی ''پیس'' کو لوہے کی سلاخ میں لگا کر گول دائرے میں لکڑیوں سے جلائی گئی آگ پر تیار کیا گیا تھا۔ مرچ تو نہ ہونے کے برابر تھی مگر ذائقہ بہت عمدہ تھا۔ ایک مچھلی وزن کے اعتبار سے ڈیڑھ دو کلو سے کم نہیں تھی جسے مشترکہ طور پر چار افراد نے کھایا۔ ہماری پلیٹ سے مچھلی ختم ہوئی تو میں اٹھ کر ایک اور ٹیبل پر چلا گیا اور وہاں دوستوں سے باتیں شروع کر کے ان کی بقیہ مچھلی سے بھی حصہ وصول کرنا شروع کر دیا بالآخر وہ بھی ختم ہو گئی۔ پُرلطف کھانے کی سبھی تعریف کرتے رہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ تیار مچھلی کا ایک ''پیس'' تین سو روپے پاکستانی میں پڑا ہے جو ہرگز مہنگا نہیں تھا۔

ٹریول ایجنسی کے مالک نے فرداً فرداً تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا اور ہاتھ ملایا کہ انہیں خدمت کا موقع دیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ محض ایک ہفتہ میں عراق جیسے تاریخی ملک کے تمام مقامات کو دیکھا نہیں جا سکتا اس کے لئے تو کم از کم ایک ماہ درکار ہوتا ہے۔ بہرحال آئندہ جب کبھی آپ لوگوں کا پروگرام ہوا ہم آپ کی بہتر خدمت کریں گے۔ اس نے انگریزی میں اپنی طرف سے کسی سہواً یا ارادتاً کوتاہی کی معذرت بھی کی۔ 11 بجے ہم ہوٹل پہنچے تو رات کا سکوت تھا اور گیٹ پر ایک لڑکا جس سے پہلے ایک دو دفعہ ملاقات ہو چکی تھی ڈیوٹی پر تھا۔ یہ لڑکا انگلش جانتا تھا اور ٹیکنالوجی یونیورسٹی کا طالب علم ہونے کے ساتھ ہوٹل میں رات کو گیٹ کیپر کی ڈیوٹی بھی کرتا تھا۔ اس سے ایک دن گفتگو ہوئی تو اس نے بتایا کہ مجھے یہاں چھ گھنٹے ڈیوٹی کے 5 ہزار دینار ماہوار ملتے ہیں اور یہ تنخواہ 100 روپے پاکستانی سے بھی کم بنتی تھی۔ میں نے اسے جب یہ بتایا کہ پاکستان میں کام کر کے وہ ماہوار دو تین لاکھ دینار کما سکتا ہے تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ گیٹ پر آج اس سے سلام دعا ہوئی تو میں نے اسے بتایا کہ ہم الصبح یہاں سے واپس چلے جائیں گے۔ اس نے بڑے خلوص سے کہا کہ وہ ہمیں الوداع نہیں کر سکے گا کیوں کہ اس کی ڈیوٹی رات 12 بجے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اتنے میں راشد نے مجھے آواز دی ''آجاؤ یار صبح جلدی اٹھنا ہے تھوڑی دیر سو بھی لیں''۔ میں عراقی نوجوان کو اللہ حافظ کہہ کر لفٹ میں راشد کے ساتھ 5ویں منزل پر اپنے کمرہ میں پہنچ گیا۔

عراقی پولیس کے ''کارنامے''

تین دن قبل ہوٹل میں متعدد کمروں سے ہمارے ساتھیوں کے سامان میں سے کرنسی کی چوری کی واردات کے بعد ہوٹل انتظامیہ کو 24 گھنٹے کا الٹی میٹم دینے کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو پولیس کو رپورٹ کی گئی۔ پولیس نے ہوٹل انتظامیہ کو وارننگ دی کہ وہ چوروں کا سراغ لگا کر متاثرین کی کرنسی واپس کریں مگر کچھ بھی نہ ہوا کسی کو ایک پائی بھی واپس نہ مل سکی تھی۔ عراق کی پولیس کی کارکردگی کے بارے میں جامعہ صدام کے طالب علم عظمت نے جو عراق میں سفر کے دوران رضا کارانہ طور پر ہمارے ساتھ رہے بتایا کہ جب وہ نیا نیا عراق آیا تو جس فلیٹ میں وہ رہ رہا تھا وہاں سے اس کی غیر موجودگی میں کوئی اس کی اسناد، کیمرہ اور دیگر سامان چرا کر لے گیا۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ پولیس اسٹیشن گیا تو انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس رپورٹ لکھنے کے لئے کاغذ نہیں ہے۔ اس نے سفید کاغذ لا کر دیئے تو پنسل بھی اسے ہی دینا پڑی۔ رپورٹ لکھنے کے بعد سپاہی نے کہا ''ہم نے چوری کی رپورٹ تو لکھ لی ہے اور اگر کہیں سے تمہیں چور کا سراغ مل جائے تو ہمیں بتا دینا''۔ عظمت نے بتایا کہ کچھ دنوں بعد وہ بازار گیا تو ایک دوکان پر اس نے اپنا کیمرہ اور دیگر سامان پہچان لیا۔ پولیس کو بتایا تو انہوں نے اس دکاندار کو پکڑا اور مجھے کچھ سامان واپس دلا کر چور کو ''مال پانی'' بنانے کے بعد چھوڑ دیا۔

جن احباب کی چوری ہوئی تھی وہ مجبوراً رات گذارنے کے لئے اس ہوٹل میں دوبارہ آئے تھے ورنہ تو وہ یہاں ایک منٹ ٹھہرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ بعض حضرات کی تو تمام کی تمام کرنسی چوروں نے اڑا لی تھی اور وہ کھانا کھانے کے لئے بھی ادھار لیتے تھے باقی ضروریات تو ایک طرف رہ گئیں۔

عراق کے مشہور شہر بصرہ جانے کا اتفاق اس لئے نہ ہو سکا کہ کویت کی سرحد کے نزدیک

واقع ہونے کی وجہ سے 91ء کی جنگ میں یہ شہر سب سے زیادہ تباہی کا شکار ہوا اور ہنوز وہاں کی سڑکیں اور عمارات مرمت یا دوبارہ تعمیر نہیں ہو سکی تھیں۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا تھا کہ وہاں اس قدر بارود گرایا گیا کہ دنیا کی بہترین قسم کی کھجوروں کے تمام باغات جل کر بھسم ہو گئے۔ پاکستان میں کسی زمانے میں بصرہ کی کھجور نام لے کر فروخت ہوا کرتی تھی۔

الصبح ہم بغداد سے ایران واپسی کے لئے روانہ ہوئے تو اکثر ہم سفر بس میں بیٹھ کر بقیہ نیند پوری کرنے لگے کیوں کہ رات سونے کے لئے چند گھنٹے میسر آئے تھے۔ بغداد سے خسروی بارڈر تک کا سفر دو گھنٹے کا ہے اور جب ہم ''دوگھر'' نامی قصبہ میں جا کر رکے تو ہمارے چند ساتھیوں نے گائیڈ کو گھیر لیا کہ اس نے ہمیں راستے میں واقع حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے مزار پر لے کر جانا تھا۔ اس نے جواباً کہا کہ اس نے تو راستے میں اس مقام کی طرف اشارہ کیا تھا مگر آپ لوگ سو رہے تھے۔ اب تو وہ مقام کافی پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ عراق میں عظیم عاشق رسول حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو لوگ صرف ''شیخ اویس'' کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جس جگہ ان کی قبر ہے اس مقام کا نام بھی ''شیخ اویس'' ہے جو سڑک سے دور دائیں جانب واقع ہے۔ کئی دوست گائیڈ اور ڈرائیورز سے اس بات پر اصرار کر رہے تھے انہیں اس مقام پر واپس لے کر چلو لیکن بعد میں وہ اس مطالبہ سے دستبردار ہو گئے۔

''دوگھر'' وہی قصبہ ہے جہاں ہم نے عراق میں داخل ہونے کے بعد پہلا کھانا کھایا تھا۔ اب بھی ہم اسی ہوٹل پر ناشتہ کے لئے آئے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ اکثریت کے پاس عراقی دینار نہیں تھے کیوں کہ انہوں نے واپسی کی وجہ سے خرچ کر لئے تھے اور ہمارے منتظمین کہہ رہے تھے ناشتہ کا ''بل'' آپ کو اپنی جیب سے ادا کرنا ہوگا۔ ہم نے شور مچا دیا کہ یہ آخری ناشتہ بھی ٹریول ایجنسی والے ہمیں کرائیں اور ہم اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ سب نے کباب، روٹی اور چائے سے حسب منشاء پیٹ بھرا کیوں کہ بل تو ٹریول ایجنسی جسے عربی میں (شرکہ) کہتے ہیں کے ذمہ تھا۔ اس قصبہ میں کھجوریں دکانوں پر تیار پڑی تھیں حالانکہ بغداد یا کسی دوسرے شہر میں یہ کھجوریں نظر نہیں آئیں۔ میں نے سوچا کھجوریں اچھی ہیں خرید لیتے

ہیں گو دینار جیب میں نہیں تھے۔ ایک دوست نے بتایا کہ ہوٹل والا کرنسی تبدیل بھی کرتا ہے۔ میں نے اسے 50 امریکی ڈالر دیئے تو اس نے چھپا کر 1000 دینار دے دیئے۔ باہر دکان پر کھجوریں 150 دینار کی کلو مل رہی تھیں۔ میں نے 3 کلو اور عارف سعید نے 5 کلو خرید لیں۔ باقی کرنسی کے ہم نے انار خرید لئے۔ ہوٹل کے ساتھ کھجوروں کی دکان سے عارف سعید نے 50 امریکی ڈالر دے کر کہا کہ کرنسی تبدیل کر دو تو اس نے اسے دو نوٹ تھما دیئے۔ میں نے دیکھا تو وہ ایرانی ریال تھے اور وہ بھی شاہ کے دور کے نوٹ تھے۔ مجھے علم تھا کہ یہ متروک ہو چکے ہیں میں نے واپس کر دیئے اور کہا کہ ہمیں دینار چاہئیں۔ اسی دکان سے یٰسین چاند جو فیصل آباد میں کپڑے کا کاروبار کرتے تھے اور موٹے تازے ہونے کے باوجود حساب کتاب میں خاصے تیز تھے نے چپکے سے ایرانی کرنسی تبدیل کر لی۔ کیوں کہ اس کے بعد ایرانی کرنسی کی ضرورت پڑنا تھی جب کہ میرے پاس پہلے سے کچھ ایرانی کرنسی تھی۔ ''دوگھر'' میں گھنٹہ بھر قیام کے بعد ہم بارڈر پر 10 بجے کے بعد پہنچ گئے۔

ایران واپسی

امیگریشن کے دفاتر کے باہر ہماری بسیں جا کر رکیں تو ہمارے ذہنوں میں تھا کہ یہ لوگ حسب روایت ہر چیز کھول کر کڑی تلاشی لیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے سرسری طور پر ہمارے بریف کیس چیک کئے اور ''پاسپورٹس'' پر خروج کی مہریں لگا دیں۔ جن حضرات کی آڈیو کیسٹس حکام نے داخلہ کے وقت قبضہ میں لے لی تھیں وہ انہیں واپس مل گئیں اور اب کے عراقی سپاہی کوئی چیز مانگ نہیں رہے تھے۔ آدھے گھنٹے میں ہمیں فارغ کر دیا گیا اور ایرانی بارڈر کے قریب بسوں سے اپنے سامان سمیت اُتر آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کوئی عراقی وزیر یہاں دورے پر آیا ہوا ہے اس لئے یہاں اس قدر ڈسپلن ہے اور انہوں نے جلدی جلدی ہمیں فارغ بھی کر دیا۔

پیدل بارڈر کراس کرنے سے پہلے ہم نے ٹریول ایجنسی کے حکام، بس ڈرائیورز سے ہاتھ ملائے اور انہیں اللہ حافظ کہا اور دورہ کے دوران اپنے گائیڈ ابوسیف کو میں نے اپنا ایڈریس دیا اور معانقہ کرنے کے بعد میں نے 50 امریکی ڈالر کا نوٹ اس کی جیب میں ڈال دیا اور کہا کہ اسے تبدیل کروا لیجئے گا۔ ابوسیف 45 سال عمر کا شریف الطبع شخص تھا۔ سر کے درمیان میں بال بالکل نہیں تھے مگر نیچے اِردگرد جھالر میں سفید بال زیادہ تھے۔ پورے دورہ میں وہ پینٹ شرٹ پہنے ہمارے ساتھ تھا۔ اکثر اوقات اس کی شرٹ کے کالر بوسیدہ ہو کر پھٹے نظر آئے جو غالباً عراق میں انفرادی اقتصادی بدحالی کا نتیجہ تھا۔ وہ ہاتھ میں تسبیح بھی رکھتا تھا اور عربی لہجہ میں اچھی انگریزی بولتا تھا۔ وہی مسٹر کو مستر کہنے والی اور انشاء اللہ اس کا تکیہ کلام تھا جو وہ ہر بات کے آخر میں کہتا۔ دورانِ گفتگو تسبیح کے دانے بھی گراتا رہتا تھا۔ میں نے اپنا بریف کیس اور کھجوروں والا تھیلا اٹھایا اور ایرانی چوکی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

ایرانی امیگریشن اور عراقی امیگریشن کے دفاتر کے درمیان خاصا فاصلہ ہے اور درمیان میں پہاڑ بھی ہے جس کے گرد چکر کاٹ کر ویگن ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے۔ ہم کوئی آدھ گھنٹہ ویگن کے انتظار میں وہاں بیٹھے رہے۔ اس دوران سامنے عراقی وزیر جو وہاں دورے پر آئے تھے کو دیکھا جو بارڈر پر تعینات فوجی افسروں کے ساتھ اِردگرد کا جائزہ اور معلومات لے رہے تھے۔ دھوپ تیز تھی مگر مجبوراً اس میں کھڑے اور بیٹھے رہے۔ منتظمین ویگن لے آئے جس میں کچھ لوگ بیٹھ کر چلے گئے۔ ہم نے بعد میں آنے والی ویگن میں اپنا سامان رکھا اور بیٹھ کر ایرانی امیگریشن کے دفاتر کے باہر حسب حکم اپنا سامان لائن میں رکھ کر دوسری طرف مسافر خانہ میں آ کر بیٹھ گئے اور ایران میں داخلہ کے فارم بھرنے شروع کر دیئے۔ فارم بھر کر پاسپورٹس سمیت جمع کروائے پھر ان پر ''انٹری'' کی مہریں لگیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنا سامان چیک کرواتے میں اور یٰسین چاند یہاں قائم بڑے جنرل سٹور میں گئے اور پینے کے لئے یٰسین نے دو ''نوشابہ'' (بوتل) لیکر جب اسے ایرانی نوٹ دیا تو دکاندار جو نوجوان اور تیز طراز تھا نے نوٹ کو بغور دیکھا اور پوچھا:

''یہ کہاں سے لیا، اور بھی ہیں؟''

یٰسین چاند نے کہا ''یہاں سے ہی لیا ہے، کیا بات ہے؟''

دکاندار نے کہا ''اور نوٹ دکھاؤ''۔

یٰسین نے ایک دو نوٹ اسے دکھائے تو دکاندار نے جھپٹ لئے اور ساتھ رکھی چھوٹی سی مشین میں سے گذار کر دیکھا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس دوران یٰسین چاند بوکھلا گیا اور بوتل وہیں چھوڑ دی۔ میں بھی تھوڑا سا پریشان ہوا کہ نوٹ میں گڑ بڑ ہے جو دکاندار اتنا چہک رہا ہے۔ دکاندار نے یٰسین کو کہا ''وہ بوتل پی لے'' کوئی بات! اس دوران دکاندار نے ایک لڑکے کو باہر غالباً آرمی یا پولیس کے کسی آدمی کو لانے کے لئے بھیج دیا۔ ہم نے جیسے تیسے بوتل ختم کی تو ایک سپاہی آ گیا۔ دکاندار نے نوٹ دکھاتے ہوئے بتایا کہ ان کے پاس ایسے اور بھی جعلی نوٹ ہیں۔ یٰسین چاند کا سفید رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ سپاہی نے اشارے سے کہا ''میرے

ساتھ آؤ''۔ وہ یٰسین کو ساتھ لے کر باہر نکلا تو میں نے جا کر دو بوتل کی رقم دکاندار کو دی اور انتظار گاہ میں آ کر یٰسین کے عزیز چشتی صاحب کو ماجرہ بتایا تو منتظمین اور دیگر چند افراد کے ساتھ وہ پولیس چوکی گئے اور گفت وشنید کے بعد یٰسین کے پاس تمام جعلی ایرانی نوٹ جو اس نے 150 امریکی ڈالرز کے بدلے ''دوگھر'' میں ہوٹل کے ساتھ کھجوروں والی دکان سے لئے تھے ایرانی حکام کے حوالے کر دیئے۔ جنہوں نے بعد میں کاٹ کر ضائع کئے اور یٰسین چاند کو رہائی ملی۔

اب ہمیں کہا گیا کہ تمام لوگ اپنا سامان چیک کروائیں۔ جب میری باری آئی تو کاؤنٹر پر دو ایرانی افسران کے سامنے میں نے اپنا بریف کیس کھولا۔ انہوں نے اس کے تمام خانے دیکھنے شروع کر دیئے اوپر کے حصہ میں، میں نے ایک عراقی انگریزی اخبار ''بغداد ٹائمز'' کی کاپی رکھی اور ساتھ میں ایک پاکستانی اخبار کا خواتین ایڈیشن تھا جس میں میرا مضمون چھپا تھا۔ یہ دونوں اخبار انہوں نے کھول کر اچھی طرح دیکھے۔ میں نے اشارتاً کہا کہ میں نے بغداد ٹائمز اس لئے رکھا ہے کہ اس میں سگریٹ کے نقصانات سے متعلق تحقیقی مضمون چھپا ہے اور میں اینٹی سموکنگ تحریک کا حامی ہوں۔ ایرانی حکام عراق سے آنے والے افراد کی چیکنگ کے دوران یہ دیکھتے ہیں کہیں کوئی حکومت مخالف مواد ایران میں لایا تو نہیں گیا۔ بہرحال مجھے انہوں نے فارغ کر دیا۔ اسی طرح چیکنگ کے بعد سب اپنا اپنا سامان اٹھائے کرمان شاہ تک لے جانے والی چھوٹی بسوں میں سوار ہوتے گئے اور کارواں سہ پہر کے بعد پھر چل پڑا۔ راشد نے عراق جاتے وقت ایرانی عورتوں کا وہ بیگ بھی واپس لے لیا جو ہم حکام کے حوالے کر گئے تھے۔ ہمارا پروگرام تھا کہ بیگ بس والوں کو واپس کر کے جائیں گے۔

راستہ وہی تھا جس سے گذر کر ہم عراق گئے تھے۔ پہاڑوں کے درمیان سے گذرنے والی سڑک ایک جگہ کافی بلندی پر پہنچی تو وہاں نمازِ عصر کے لئے رک گئے۔ یہاں ایک دو ہوٹل بنے ہوئے تھے جن پر آنے اور جانے والی بسیں اور ویگنیں کچھ دیر کے لئے قیام کرتیں اور اس دوران مسافر چائے، سگریٹ، ٹھنڈا یا آئس کریم وغیرہ لیتے۔ اس جگہ پانی بہت ٹھنڈا تھا اور

دکان پر آئس کریم کے چھوٹے کپ دستیاب تھے۔ قاسم نے بتایا کہ آئس کریم اچھی ہے اور سستی بھی۔ ہم نے بھی ایک ایک کپ لے لیا جس پر گائے کی تصویر بنی ہوئی تھی سفید رنگ کی آئس کریم کا ''لائٹ ٹیسٹ'' اچھا لگا۔

ریفریشمنٹ کے بعد سب نے اپنی اپنی سیٹ سنبھالی اور کرمان شاہ ہم رات کے اندھیرے میں پہنچے۔ ویگن والوں نے ہمیں شہر کے مرکزی ٹرمینل (لاری اڈہ) جا کر اتار دیا جہاں سے ہمیں تہران روانہ ہونا تھا۔ کرمان شاہ کا ٹرمینل بھی بڑے رقبہ میں بنا ہوا تھا۔ ہر ٹرانسپورٹ کمپنی کا الگ دفتر تھا اور اس کی بسیں دفتر کے سامنے سے گنجائش کے مطابق مسافر بٹھا کر روانہ ہو رہی تھیں۔ رفع حاجت کے لئے ایک بڑے کمرہ میں 10 طہارت خانے اور وضو کے لئے علیحدہ سے اتنی ہی ٹونٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہمارے منتظمین تہران جانے کے لئے سپیشل بسیں کرایہ پر لینے کے لئے مختلف دفاتر میں گفت وشنید کرتے رہے اور بالآخر رات 11 بجے تہران کے لئے ہماری روانگی ممکن ہوئی۔

آیت اللہ خمینی کے مقبرہ پر

کرمان شاہ سے تہران کا فاصلہ 525 کلومیٹر ہے۔ رات کا کھانا کسی نے بھی نہیں کھایا تھا۔ اس لئے رات 12:30 سڑک کنارے بلند جگہ پر واقع ایک ہوٹل پر بسیں روک کر ہم اندر گئے تو ان کے پاس تھوڑا بہت کھانا موجود تھا اور ٹھنڈی روٹیاں ہمارے سامنے لا کر رکھ دی گئیں۔ بھوک ستا رہی تھی اس لئے جو بھی ہوتا کھا لیتے کیوں کہ جب بھوک زوروں پر ہو تو انسان نخرے نہیں کرتا اور اکثر اوقات جو مل جائے پیٹ بھر لیتا ہے۔ ہم نے دال منگوالی جو سٹیل کی چھوٹی سی پیالیوں میں تھی۔ اس میں گوشت کی ننھی ننھی بوٹیاں بھی معلوم ہوئیں۔ رات کو سردی کا تھوڑا بہت احساس ہو رہا تھا اس لئے چائے کا دور بھی چلایا اور طویل سفر کا پھر سے آغاز ہو گیا۔ رات بھر سفر جاری رہا اور صبح فجر کے وقت ہم ''قم'' میں حضرت معصومہ قم رضی اللہ عنہا کے مزار پر تھے۔ وہاں اس وقت بڑی تعداد میں خواتین و حضرات جمع تھے۔

وہاں حاضری، فاتحہ اور نماز فجر کے بعد 9 بجے ہم انقلاب ایران کے بانی آیت اللہ خمینی کے وسیع و عریض مقبرہ کے سامنے پہنچے تو کچھ حضرات نے وہاں رکنے کے لئے کہا۔ بسیں پارکنگ میں کھڑی ہوئیں تو ہم نیچے اتر آئے۔ سڑک سے 5 فٹ اونچائی پر وسیع و عریض رقبہ پر خوبصورت گراسی پلاٹ بنائے گئے ہیں اور درمیان میں فلک بوس عمارت میں آیت اللہ خمینی کا مقبرہ ہے۔ عمارت کے اِردگرد چار بڑے بڑے مینار ہیں اور مرکزی عمارت کے اندر باہر خطاطی، نقاشی اور شیشہ کاری کے نادر نمونے نظر آتے ہیں۔ مقبرہ کے اندر داخل ہونے والے ہر شخص کی تلاشی لی جاتی ہے میرے پاس کیمرہ تھا جسے دیکھ کر سپاہی نے روک لیا اور فارسی میں کچھ کہا جس کی مجھے سمجھ نہ آئی۔ میرے پیچھے حق نواز تھا اسے فارسی آتی تھی اس نے کہا یہ کہتا ہے کہ یہاں اپنی فوٹو بنواؤ۔ اس نے میرے ہاتھ سے کیمرہ لے کر کھڑے کھڑے میری تصویر

بنائی تو ہم اندر چلے گئے۔ اندر بے شمار خواتین مرد اور بچے قبر کے اِردگرد موجود تھے اور اِردگرد جالیوں سے کرنسی نوٹ بھی اندر پھینک رہے تھے جیسا کہ عراق میں بھی مزارات پر ہوتا ہے۔

یہاں سے تہران شہر تقریباً 50 کلومیٹر تھا اور بس والے کہہ رہے تھے وہ ہمیں شہر کے اندر لے کر نہیں جائیں گے کیوں کہ دوپہر کے وقت وہاں رش ہو جاتا ہے اور انہیں وہاں مشکل پیش آئے گی۔ مگر ان کی بدقسمتی دیکھئے کہ انہوں نے ہمیں شہر سے باہر اتارنے کی پوری کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے اور جس ہوٹل میں ہمارا قیام تھا وہ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی تھا مگر علم نہ ہونے کی وجہ سے ڈرائیور شہر کے مرکز میں چلا گیا۔ اس طرح گھومتے ہوئے ہم نے تہران کا کافی حصہ دیکھ لیا۔ بالآخر ایک جگہ اسے ٹریفک والے نے روک کر چالان کر دیا۔ نتیجتاً ہمیں انہوں نے پررونق سڑک کے کنارے ہی اتار دیا۔ سامان سمیت ہم فٹ پاتھ پر بیٹھے تھے اور پاس سے گذرنے والے راہ گیر حیرت سے ہمیں دیکھتے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ ہمارے دائیں جانب ایک مسجد تھی وہاں ظہر کی اذان ہوئی۔ اس کے بعد جماعت ہو رہی تھی کہ ہم مسجد میں چلے گئے اور وہاں امام کے پیچھے نمازیوں سے الگ کونے میں ایک نو دس سالہ بچہ بغلوں میں ہاتھ دیئے مائیک کے سامنے کھڑا تھا جو امام صاحب کی طرف سے رکوع اور سجود کی ادائیگی کا اعلان کر رہا تھا۔ ہم نے یہ جماعت ختم ہونے کے بعد نماز ادا کی۔

3 بجے منتظمین کا میزبان سے ٹیلی فون پر رابطہ ہوا تو ہم لوگ پک اپ ویگنوں میں ہوٹل پہنچے جہاں دوسری منزل پر ہمیں کمرے ملے۔ ایک کمرہ میں چار بیڈ تھے۔ ہوٹل میں سنگ مرمر وافر مقدار میں لگایا گیا تھا معلوم ہوا کہ ایران میں سنگ مرمر بہت عمدہ قسم کا پایا جاتا ہے اور پاکستان کے مقابلہ میں بہت سستا ہے۔ ہمیں عراق سے خریدی ہوئی کھجوروں کی فکر تھی کہ وہ کس حال میں ہوں گی کیوں کہ ایک اور ساتھی جس نے کچی کھجوریں ٹوکرے میں خریدی تھیں وہ راستے کی دھوپ میں پک کر خراب ہو گئی تھیں۔ مگر ہماری کھجوریں اچھی حالت میں برآمد ہوئیں۔ ہم نے کمرے میں پنکھا چلا کر کھجوریں پھیلا کر خشک ہونے کے لئے رکھ دیں۔ میرا نہانے کو دل چاہ رہا تھا مگر ہوٹل کے باتھ روم میں یخ پانی نے صابن سے ہاتھ منہ دھونے تک ہی محدود رکھا۔

تہران کا پی سی او

ہوٹل میں کچھ دیر آرام کے بعد پاکستان ٹیلی فون کا خیال آیا۔ کسی نے بتایا کہ ہوٹل کے عقب میں سرکاری پی سی او ہے جہاں پاکستان کال کے دس روپے فی منٹ چارج کرتے ہیں ہم فوراً وہاں پہنچ گئے۔ پی سی او پر طریقہ کار یہ تھا کہ پہلے کاؤنٹر پر فارم میں اپنا نام، ملک اور ٹیلی فون نمبر نوٹ کروانے کے ساتھ 5000 ریال ایڈوانس جمع کروائیں اور باری کا انتظار کریں۔ میں نے فارم اور ایڈوانس جمع کروایا تو دس پندرہ منٹ بعد اندر سے آواز آئی ''مسٹر اعجاز، پاکستان، بوتھ نمبر 2''..... میں نے جھٹ سے بوتھ میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور ریسیور اٹھایا تو گھنٹی جا رہی تھی۔ دوسری طرف سے ریسیور اٹھانے پر گھر میں تقریباً 5 منٹ تک بات ہوتی رہی۔

فون ختم کرنے کے بعد میں نے دوسرے کاؤنٹر پر بتایا کہ میری بات ختم ہو گئی ہے۔ وہاں بیٹھے ایرانی نے میرا بکنگ فارم دیکھا تو اس پر کال کا وقت 7 منٹ درج تھا۔ اس نے 5000 ریال میں سے 700 ریال منہا کر کے باقی مجھے رسید سمیت واپس کر دیئے۔ ایک دو اور احباب کے فون کے دوران کے وقت کا میں نے حساب رکھا تو کاؤنٹر پر اس وقت سے دو منٹ زیادہ کے پیسے چارج کئے گئے یعنی یہاں بھی چکر چلایا جا رہا تھا۔ مگر رسید پر وقت وہی درج ہوتا تھا جن کے چارجز لئے جاتے تھے۔ اگر کسی کی کال درمیان میں کٹ گئی تو اسے دوبارہ بکنگ اور 5000 ریال جمع کرانے کے مرحلہ سے گذر کر انتظار کرنا پڑتا۔

ہمارے گروپ کے تمام حضرات کی بات ہو چکی تو ہم نے ''شاپنگ'' کے لئے بازار جانے کا پروگرام بنایا۔ ایک دوست نے ہماری رہنمائی کی کہ یہاں سے ٹیکسی لے کر ''کوچہ برلن'' جائیں وہاں بڑی بڑی دوکانیں ہیں۔ تہران میں ٹیکسی والے عام طور پر ایک آدمی کے

100 تومان لیتے ہیں ہم نے ایک ٹیکسی روکی تو راشد نے ڈرائیور سے کہا:

''کوچہ برلن''؟ اس نے چار بندے دیکھ کر ہاتھ کی چار انگلیاں لہرائیں اور بولا:

''چہار صد تومان''۔

جواب میں راشد نے کہا: ''سہ صد تومان''۔

تین سو کا سن کر اس نے دوبارہ ''چار صد تومان'' کی آواز دی تو ہم نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ ٹیکسی چلی گئی چند منٹ بعد ایک اور ٹیکسی کو راشد نے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور کہا ''کوچہ برلن''۔ ڈرائیور نے کہا ''بیٹھو''۔

راشد نے کہا ''چہ تومان؟''

اس نے کہا ''چہار صد''۔

راشد نے کہا ''نہ سہ صد''۔

وہ جانے لگا تو راشد نے جلدی میں ''سہ و نصف صد تومان'' کہا تو وہ مان گیا میں ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر جب کہ راشد، عارف اور بشیر پیچھے بیٹھ گئے۔ تہران شہر کو اندر سے بہت خوبصورت پایا۔ ٹیکسی اچھی خاصی رفتار سے کھلی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی جہاں کہیں اشارہ آتا وہاں ڈرائیور اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنی رفتار برقرار رکھتا اور اس نے بہت کم بریک لگائی۔ سڑک کے دونوں جانب قدیم و جدید اور صاف ستھری عمارات میں دوکانیں اور دفاتر مسلسل ہمارے ساتھ تھے۔ 20 منٹ بعد سڑک کے کنارے ٹیکسی رکی تو سامنے ''کوچہ برلن'' کا بورڈ پڑھ کر میں نے کہا ''اُترو بھئی بازار آ گیا''۔

بازار کے شروع میں دائیں جانب اونی ملبوسات کی بڑی بڑی دوکانیں تھیں جہاں بڑی تعداد میں بچوں بڑوں کے سویٹرز اور جرسیاں وغیرہ پڑے تھے۔ ایک دو دوکانوں پر ہمیں ریٹ زیادہ محسوس ہوئے تو ہم آگے بڑھتے گئے۔ بازار میں عورتیں اکثریت میں تھیں۔ دوکانوں کے اندر بھی خریدار عورتوں کا رش تھا۔ ایک دوکان پر راشد نے اونی جرسیاں پسند کیں۔ دراصل ہم یہاں زیادہ خریداری اس لئے نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ

ایران کے شہر ''مشہد'' کی مارکیٹ بہت بڑی ہے اور وہاں چیزیں سستی ملتی ہیں۔ ایک دو مردانہ جرسیاں اور اپنے بھتیجے فیضان کے لئے سوٹ میں نے بھی خرید لیا اور چونکہ بازار دیکھنے نکلے تھے اس لئے مٹرگشت کرتے رہے۔

کھلا بازار تھا اور دوکانیں ہر قسم کے سامان سے بھری پڑی تھیں۔ رش کے باوجود شور و ہنگامہ نہیں تھا۔ عورتوں کے فیشن کے جدید سامان کی ورائٹی سے شوکیس بھرے ہوئے تھے اور لاہور کا انارکلی بازار کوچہ برلن کے بازار سے بہت چھوٹا محسوس ہوتا تھا۔ شام ہو رہی تھی اور ابھی آدھا بازار دیکھنا باقی تھا مگر تمام حضرات کی ہمت جواب دے گی اور واپسی پر ایک دوکان سے کچھ لیڈیز جرسیاں بھی نئے ڈیزائن دیکھ کر ہم نے خرید لیں اور سڑک پر آ گئے۔ واپسی کا پتہ ہمیں معلوم نہیں تھا مگر اتفاق سے عارف کے پاس ہوٹل کا کارڈ تھا جو ہم نے ٹیکسی والے کو دکھایا تو اس نے کہا ''چہار صد تومان''۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور میں نے کہا ''ٹھیک ہے وقت ضائع نہ کریں۔ آتے ہوئے تو ہم نے مروجہ کرایہ سے 50 تومان بچا لئے تھے اب چلو اور ہوٹل پہنچو''۔ ہم بیٹھ گئے اور روشنیوں بھری سڑکوں سے گذرتے ہوئے ہوٹل کے سامنے اُتر گئے۔ میں نے چار سو تومان ڈرائیور کو تھمائے اور اپنی راہ لی۔

جرسیاں وغیرہ کمرہ میں رکھ کر دوبارہ کھانے کے لئے نیچے اُتر آئے اور ہوٹل کے عقب میں مشرقی سمت والی سڑک پر چلتے ہوئے ہمیں کباب اور چکن وغیرہ کی دکان نظر آئی۔ ہم اندر جا کر بیٹھ گئے۔ ملازم لڑکا آیا تو اسے بتایا کہ دو کباب فی نفر (آدمی) لے آؤ۔ بیٹھنے کی جگہ کے پیچھے بند کمرہ میں کباب لگائے جا رہے تھے یہ نہیں کہ پاکستان کی طرح وہیں کھانے والے بیٹھے ہیں اور وہیں کباب لگانے والے۔ نتیجتاً دھواں اور راکھ کھانے والوں پر پڑ رہی ہوتی ہے۔ ایران کی تمام دکانوں میں صفائی کا انتظام بہت عمدہ تھا۔ کھانا کھا کر میں نے بل ادا کیا (چونکہ مشترکہ حساب کتاب کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی) تو ہوٹل کا مالک پوچھنے لگا 'کباب مزیدار''۔ میں نے کہا ''ہاں، خوب مزیدار'' وہ خوش ہو گیا۔

ہم تھکے ہوئے تھے اور سیدھے ہوٹل اپنے کمروں میں بستروں پر دراز ہو گئے۔ صبح آنکھ

ذرا دیر سے کھلی کیوں کہ رات سردی محسوس ہونے کی وجہ سے کمبل بھی اوڑھنے پڑے تھے۔ ہمارے کمرے کی ایک کھڑکی باہر سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ اس میں سے سامنے دیکھا تو ریلوے اسٹیشن پر صبح صبح خاصا رش تھا اور لوگ تیزی سے آ جا رہے تھے غالباً کوئی ٹرین آئی تھی۔ تہران کے اس مرکزی ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ کے بغیر داخلہ ممکن نہیں اور ہر آنے والے کی باقاعدہ تلاشی لی جاتی ہے۔ کمرے میں بیٹھے بیٹھے ہم نے کھلی پڑی ہوئیں کھجوریں ''ٹیسٹ'' کرنا شروع کر دیں اور کھاتے چلے گئے۔ بالآخر جب میں نے دیکھا کہ راشد اور بشیر اعوان کھانے سے باز نہیں آ رہے تو میں نے کہا ''اب بس کرو، ہم نے انہیں پاکستان لے کر جانا ہے تمہارے کھانے کے لئے نہیں خریدیں''۔ کیوں کہ تمام کھجوریں میں نے اور عارف سعید نے خریدی تھیں۔

حمام عمومی اور حمام خصوصی

دو تین دن سے نہانے کا موقعہ نہیں ملا تھا اور ہوٹل کے باتھ کا پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ ناشتہ کرنے اور نہانے کی غرض سے کمرہ ''لاک'' کر کے باہر نکلے تو ہمارے استفسار پر ایک دوست نے بتایا کہ پی سی او سے تھوڑا پہلے کافی بڑا حمام ہے وہاں گرم پانی اور صابن تولیہ سب کچھ ہے۔ وہ بھی وہاں سے غسل کر کے آیا تھا۔ ہماری تو جیسے بگڑی بن گئی فوراً حمام کی طرف چل دیئے۔ باہر سے حمام کا دروازہ چھوٹا سا تھا مگر اندر آٹھ دس غسل خانے بنے ہوئے تھے۔ ایران میں حمام دو قسم کے ہوتے ہیں حمام عمومی اور حمام خصوصی۔ حمام عمومی تو وہی ہیں جس طرح کے ہمارے ہاں ہوتے ہیں جب کہ حمام خصوصی کا الگ سلسلہ ہے۔ جہاں غالباً ایرانیوں کے علاوہ کوئی نہیں جا سکتا۔ اس میں دروازے پر ایک شخص بیٹھا ہوتا ہے جس کو پیسے دے کر آدمی ایک چابی حاصل کر لیتا ہے اور آگے مختلف خانے بنے ہوتے ہیں جن پر نمبر لگائے گئے ہیں جس کے پاس جس نمبر کی چابی ہو وہ خانہ کھول لیتا ہے اور اس میں صابن، تیل، تولیہ وغیرہ موجود ہوتا ہے۔ آدمی اپنے کپڑے اتار کر وہاں خانے میں ہی رکھ دیتا ہے اور صرف انڈر ویئر پہن کر مشترکہ غسل میں شامل ہو جاتا ہے۔ عمر رسیدہ ایرانی زیادہ تر حمام خصوصی میں جاتے ہیں۔ اسی طرح عورتوں کے لئے بھی الگ سے حمام خصوصی بنائے گئے ہیں۔ جس حمام میں ہم گئے تھے وہاں غسل خانے دو حصوں پر مشتمل تھے پہلے حصے میں کپڑے رکھئے اور دوسرے میں نہائیے۔ پانی تیز گرم اور اچھا تھا۔ البتہ تولئے کی جگہ موٹی سی میلی چادر دیتے تھے۔ ہمارے پاس تو اپنے تولیے تھے اس لئے یہ چادر استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

گرم حمام پر غسل کا مزہ اس لئے بھی آیا کہ صرف 50 تومان فی کس یعنی 5 روپے

پاکستانی سے بھی کم ادا کرنے پڑے۔ حمام سے نکلے تو ہوٹل کے نیچے واقع برگر شاپ پر ناشتہ کے لئے آ گئے۔ یہاں برگر ایک لمبوتری نان نما روٹی کو درمیان میں سے کاٹ کر اندر دو اُبلے انڈے، ٹماٹر اور اچار کی کاشیں پیک کر کے دے دیتے اور ساتھ میں بوتل بھی پئیں۔ جمعہ کی وجہ سے کافی دکانیں بند تھیں۔ ناشتہ کا بل ادا کرنے کے بعد ہمارے پاس کرنسی ختم ہو رہی تھی۔ کرنسی تبدیل کروانے کے لئے ایک دوست شمشاد سے بات کی تو اس نے کہا کہ بازار زرگراں میں آج بھی کرنسی تبدیل ہو جائے گی وہاں لوگ بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہم نے اسے کہا کہ وہ ہمارے ساتھ چلے۔ موصوف بھکر کے رہنے والے تھے اور خاصے تیز طرار۔ ہم نے ٹیکسی پکڑی اور بازار زرگراں کے باہر اُتر گئے۔ اِردگرد تمام دکانیں مکمل طور پر بند تھیں اور سڑکوں پر ٹریفک بھی عام دنوں کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ بند دکانوں کے اوپر منی چینجرز کے بورڈ لگے ہوئے تھے اور فٹ پاتھ پر دو تین نوجوان ہاتھوں میں کالے رنگ کے شاپنگ بیگ تہہ کر کے پکڑے پھر رہے تھے۔

شمشاد نے ایک سے پوچھا:

''پاکستانی روپیہ کا کیا ریٹ ہے؟''

اس نے کیلکولیٹر پر بتایا ''11 تومان''۔

شمشاد نے کہا ''نہیں، 12 تومان''۔

ایرانی کے انکار کے بعد ہم پیچھے مڑ رہے تھے کہ ایک اور ایرانی خود ہی ہمارے پاس آ گیا اور کہنے لگا: ''منی چینج؟''

شمشاد نے کہا: ''ہاں''

''کیا ریٹ ہے؟''

اس نے 11.30 تومان کیلکولیٹر پر دکھائے۔

شمشاد نے کہا: ''نہیں 12 تومان''

وہ مان گیا۔

شمشاد ہمیں کہنے لگا کہ چھٹی کی وجہ سے آج اس سے زیادہ ریٹ نہیں ملے گا حالانکہ عام دنوں میں غیر سرکاری ایکسچینج ریٹ 12.30 تومان فی روپیہ تھا جب کہ بینک 9 تومان دیتے تھے۔ میں نے 5 سو روپے دیئے جب کہ عارف نے 1000 روپے دیئے اور شمشاد کو ساتھ لے کر وہ آدمی دو دوکانوں کے درمیان چھپ کر کھڑے ہو گئے اور کرنسی گننے لگے۔ ہم باہر فٹ پاتھ پر کھڑے تھے کہ ایک نوجوان سپاہی کو سامنے سے آتا دیکھ کر باہر کھڑے کرنسی تبدیل کرنے والے ایرانی اِدھر اُدھر ہو گئے۔ وہ سپاہی سیدھا اندر کی طرف چلا گیا جہاں شمشاد ایرانی سے کرنسی گن کر لے رہا تھا۔ اس نے جا کر ایرانی کو پکڑ لیا لیکن اس سے پہلے شمشاد تومان گن کر اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ وہ فوراً باہر آ گیا اور ہمیں کہنے لگا:

''نکلو، اب یہاں سے نکلو''۔

میں نے کہا ''اس ایرانی کا کیا بنے گا؟''

شمشاد نے کہا ''وہ اسے سنبھال لے گا''۔

ہم تھوڑی دُور گئے ہوں کہ وہ ایرانی بھی ہمارے پیچھے آ گیا اور سپاہی دوسری طرف چلا گیا۔ ہم کھڑے ہو گئے اور جب ایرانی ہمارے قریب آیا تو شمشاد نے پوچھا:

''سناؤ کیا چکر چلایا؟''

اس نے کہا: ''500 تومان دے کر سپاہی کو چلتا کیا''۔

میں سوچنے لگ گیا کہ یہاں بھی ہر کام نوٹ کے زور پر ہو جاتا ہے ہم لوگ تو مفت میں اپنے آپ کو کوستے رہتے ہیں۔ شمشاد نے ایرانی سے کہا کہ 5 سو روپے کی اور کرنسی دے دو۔ اس نے کیلکولیٹر پر اب کی بار ریٹ 11.30 تومان بتایا۔ شمشاد نے کہا ''کمال ہے ابھی 12 تومان دیئے اور اب 11.30 ہو گئے؟''۔ وہ بولا ''سپاہی کو دیئے گئے پیسے بھی تو پورے کرنے ہیں''۔ شمشاد نے ہمیں مشورہ دیتے ہوئے کہا ''دفع کرو کہیں اور سے تبدیل کرا لیں گے''۔

جمعہ بازار

بازار زرگراں کے پاس ٹیکسی کے انتظار میں ہم فٹ پاتھ پر تھوڑا آگے بڑھے تو دائیں ہاتھ بڑے سے گیٹ کے اندر ہمارے جمعہ/اتوار بازار کی طرز پر اچھا خاصا ہنگامہ برپا تھا۔ اندر جانے پر پتہ چلا کہ یہ واقعی جمعہ بازار ہے کیوں کہ مارکیٹ کی دوکانیں بند تھیں اور ہمارے ہاں کے میلوں ٹھیلوں پر لگنے والی عارضی دوکانوں کی طرز پر زیادہ تر ''ایرانی بابے'' قطار در قطار بیٹھے تھے۔ ہمارے ہاں تو مال بیچنے کے لئے دوکاندار آوازیں لگا رہے ہوتے ہیں مگر یہاں ہر ایک خاموش بیٹھا تھا اور پھر ان کے پاس مال ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ آوازیں لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ لکڑی اور پتھر کے نوادرات، پرانی گھڑیاں، استعمال شدہ گھریلو اشیاء اور قیمتی پتھر وغیرہ۔ انگریزی میں چھٹی والے دن لگنے والے بازار کو ''فلی مارکیٹ'' کہتے ہیں۔ ہر ایک نے علیحدہ علیحدہ اپنے سامنے زمین پر یا موبائل شوکیس میں رکھے ہوئے تھے اور دوکانداروں کی عمر کے ہی باذوق گاہک بھی ان کے پاس آ جا رہے تھے۔ چکر لگانے پر معلوم ہوا کہ ہم ہی چند نوجوان ان کے درمیان موجود ہیں۔ دوکاندار گاہک کے پوچھنے پر صرف قیمت بتاتے اور کچھ کم کرنے کی بات پر انکار میں سر ہلا دیتے۔ میں نے ایک دو گھڑیوں کی قیمتیں معلوم کیں تو وہ 2 ہزار روپے تک تھیں اس سے کمی پر دوکاندار تیار نہ تھے۔ شمشاد نے انگوٹھی میں جڑنے والے پتھر خرید لئے جو بقول اس کے سستے مل گئے تھے۔ راشد نے بھی کچھ پتھر جب کہ عارف نے لکڑی کا سگریٹ بکس جو پرانا تھا، دوکاندار کو کافی دیر تک قائل کرنے کے بعد خرید لیا۔ واپسی کے ارادہ سے ہم باہر نکل رہے تھے کہ میری نظر نیچے بیٹھے دوکاندار کے سامنے پڑے چمکدار ہاروں پر پڑی۔ میں نے رک کر دیکھا وہ تسبیح نما ہار تھے جو سلور اور گولڈن کلر میں تھے اور چائنا کے بنے ہوئے لیکن اپنی چمک اور خوبصورتی کے اعتبار سے اس

قدر جاذب نظر تھے کہ میری تقلید میں سب نے دو دو ہار خرید لئے۔ عارف نے گیٹ پر پہنچ کر کہا ''دوکاندار کے پاس باقی ایک ہار بچا ہے وہ بھی میں خرید ہی لوں''۔ میں اس کے ساتھ واپس آیا تو چیزوں کے سامنے ایک لمبے قد کا مونچھوں والا ایرانی کھڑا تھا۔ میں نے اسے پرے کرنے کے لئے اس کی بغل کے نیچے والے حصے میں ہاتھ لگایا تو اچھل پڑا کیوں کہ ہاتھ لگانے سے اسے ''گدگدی'' ہوئی تھی۔ جب اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تو اس کی اچانک اس حالت کو دیکھ کر ہم ہنس پڑے اور وہ بھی کھسیانا سا ہو گیا۔ آخری ہار خرید کر ہم نے دوکاندار کے پاس سٹاک ختم کر دیا اور ٹیکسی پکڑ کر ہوٹل آ گئے۔ ہوٹل کے ساتھ ہی جوتوں کی ایک دوکان تھی۔ اس کے باہر شوکیس میں رکھے جوتوں میں سے ایک جوتا میں نے پسند کیا جو وزن میں انتہائی ہلکا تھا اور کوریا کا بنا ہوا تھا۔ آج کل اس طرح کے جوتوں سے لاہور کے بازار بھرے پڑے ہیں جو سب چائنا کے ہیں اور ہماری مارکیٹ کے حساب سے بہت سستے ہیں۔ دوکاندار نے قیمت 45000 ریال بتائی ہم نے کم کرنے کے لئے اصرار کیا مگر وہ نہ مانا اور 450 روپے میں ہم نے بھی جوتا مہنگا سمجھ کر خریدنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

ہمیں تہران کی آبادی سے باہر ایک پہاڑی پر واقع بی بی شہر بانوں کے مزار پر جانا تھا اور چھوٹی بسیں ہمیں لے کر جانے کے لئے ہوٹل کے باہر پہنچ چکی تھیں۔ مزار تقریباً پہاڑ کی چوٹی پر ہی واقع ہے اور اردگرد بھی پہاڑ ہیں۔ پہلے پہل لوگ پیدل اس مقام پر آتے تھے مگر اب موٹر گاڑیاں پہلے گیئر میں دھیرے دھیرے اوپر تک پہنچتی ہیں جہاں پہاڑ کاٹ کر محدود پارکنگ بھی بنائی گئی ہے۔ اس مقام سے پورے تہران کا نظارہ کیا جا سکتا ہے حتیٰ کہ تہران شہر کے باہر دوسری طرف امام خمینی کے مزار کے مینار تک نظر آتے ہیں جن کا فاصلہ اس بلندی سے چالیس پچاس کلومیٹر سے کم نہیں ہوگا۔

تہران میں ہمارے میزبان شاہد صاحب سے نشست ہوئی تو انہوں نے ایرانیوں سے متعلق بتایا کہ یہ لوگ اپنی تاریخ وثقافت پر بہت مغرور ہیں خود کو دنیا کی عظیم قوم سمجھتے ہیں اور بحیثیت قوم کسی اور فرد کو اپنی صفوں میں شامل نہیں ہونے دیتے ہیں۔ وہ خود 31 سال سے

ایران میں مقیم ہیں مگر خود کو آج بھی اجنبی محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ ایرانی واقعی قوم ہیں کیوں کہ پورے ایران میں آپ کسی کو پوچھیں کہ وہ کون ہے؟ تو جواب ہوگا ''ایرانی'' اور ملک کے طول وعرض میں ایک ہی زبان ''فارسی'' بولتے ہیں۔ پاکستان کی طرح نہیں جہاں سندھ کا رہنے والا سندھی، پنجاب کا پنجابی، سرحد کا پٹھان اور بلوچستان کا بلوچی کہلانے پر فخر محسوس کرتا ہے اور قومی زبان اُردو تو ہے مگر حالت یہ ہے کہ ہر 20، 25 کلومیٹر فاصلہ پر زبان نہ سہی تو لہجہ ضرور بدل جاتا ہے۔ شامل گفتگو تمام حضرات اس امر پر متفق تھے کہ پاکستانیوں کو ایک قوم بننے میں عرصہ لگے گا اور ہمیں آزاد ہوئے ابھی نصف صدی گذری ہے اس عرصہ کے دوران ہماری تاریخ وثقافت اور روایات شکست وریخت کا شکار رہی ہیں۔

شاہد صاحب نے تہران میں بی شہر بانو کے مزار سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جب وہ ایران آئے تھے تو پہاڑی پر اس جگہ صرف ایک چھوٹی سی قبر تھی جسے ایرانیوں نے دیکھتے ہی دیکھتے مزار کی شکل دے دی اور عالی شان بلڈنگ تعمیر کروا کر زائرین کی آمدورفت کے لئے پہاڑ کاٹ کر سڑک بنا ڈالی۔ اب شب و روز لوگوں کا وہاں ہجوم رہتا ہے۔ وہ اس بات کو ماننے کو تیار نہیں تھے کہ اس جگہ بی بی شہر بانو کی قبر ہوسکتی ہے۔ ان کے پاس اس کی دلیل یہ تھی عام حالات میں بھی کوئی خاتون گھوڑے پر اس قدر بلند مقام پر پہنچ نہیں سکتی اور پھر بی بی کو اس جگہ جانے کی ضرورت کیا تھی؟ مزار کے اِردگرد ایک قسم کا میلہ لگا ہوا تھا۔ کھانے پینے کی اشیاء فروخت ہو رہی تھیں اور کئی خاندان اپنے کھانے کے ساتھ سنگ مرمر کے فرش پر بیٹھ کر انجوائے کر رہی تھیں جب کہ لڑکے بالے دائیں جانب واقع پہاڑ پر مزید اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے نظر آتے تھے۔ قبر کے اِردگرد تنگ جگہ ہے جہاں بمشکل کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی جاسکتی ہے۔ عورتوں کے لئے حصہ علیحدہ ہے جہاں سے عام طور پر شور سنائی دیتا ہے۔ واپسی پر جب گاڑیاں نیچے اُتر رہی تھیں تو چڑھائی کی نسبت زیادہ خوف محسوس ہوتا ہے کیوں کہ کراسنگ کے دوران سڑک کی چوڑائی کم محسوس ہوتی ہے اور گہرائی بہت زیادہ نظر آتی ہے۔

چائے، چینی اور عزت افزائی

ہوٹل واپس آ کر ہم نے دوپہر کا کھانا پھر کباب شاپ سے کھایا۔ ایک چوک میں ہوٹل پر چائے گاہک باہر کھڑے ہو کر لے رہے تھے۔ راشد نے کہا ''چائے'' اندر سے آدمی نے ایک چائے کا کپ سامنے رکھا تو راشد نے ساتھ ہی پڑے چھوٹے سے برتن میں سے چینی کے چار پانچ ٹکڑے اٹھا کر چائے میں ڈال دیئے جس پر ہوٹل والے کو غصہ آیا اور اس نے فوراً چائے کا کپ واپس اٹھا لیا۔ ہم سب حیران ہو گئے کہ یہ اسے کیا تکلیف ہو گئی۔ راشد کے ساتھ مل کر ہم سب نے اس آدمی کو چائے دینے کا کہا مگر اس نے ہاتھ اور زبان دونوں سے انکار کر دیا۔ اس ''عزت افزائی'' کے بعد ہم PCO کے ساتھ واقع قہوہ خانہ میں گئے اور وہاں چائے پینے کے دوران چائے والے کے رویہ پر بحث کرتے رہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہم چاروں نے چائے میں چینی کے ٹکڑے ڈالنا تھے جس سے یقیناً برتن میں پڑی چینی ختم ہو جاتی اور اسی خیال سے اس آدمی نے پہلی چائے ہی واپس اٹھا لی تھی۔ یہاں سے اٹھے تو پی سی او پر فون کے لئے بکنگ کروائی مگر اس مرتبہ آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد بھی پاکستان بات نہ ہو سکی اور بکنگ کینسل کروا کر ہم جلدی جلدی ہوٹل پہنچے جہاں نصف سے زیادہ حضرات اپنا اپنا سامان اٹھائے نیچے اُتر رہے تھے کیوں کہ مشہد جانے کے لئے بسیں سڑک پر کھڑی تھیں۔ بھاگم بھاگ ہم نے کمرہ میں پہنچ کر سامان سمیٹا اور بسوں کے قریب آ گئے جہاں ہر ایک کی کوشش تھی کہ اس کا سامان بس کے دونوں طرف بنے باکسز میں رکھا جائے اور شاپنگ کی وجہ سے ہر ایک کے پاس سامان بڑھ چکا تھا۔ ناکامی کی صورت میں بقیہ سامان اندر سیٹوں پر بیٹھ کر خود ہی سنبھالنا پڑتا۔

ہم نے ایک دوسرے کی مدد کی اور آدھے سے زیادہ سامان بسوں کے خانوں میں

رکھوانے میں کامیاب ہو گئے اس دوران میں نے آگے پیچھے چار سیٹیں ''ریزرو'' کر لیں۔ شام سے ذرا پہلے ہم مشہد کے لئے روانہ ہوئے مگر اس سے پہلے ہمیں تہران ہی میں دو مزارات پر جانا تھا اور بسیں اسی جانب جا رہی تھیں۔ تہران شہر کے ویسے تو ہر حصہ میں درخت اور سبزہ بہت ہے مگر اس طرف پارک بہت تھے۔ ایک جگہ بچے گراسی گراؤنڈ میں فٹ بال کھیل رہے تھے جنہوں نے ہمارے ہاں گلیوں میں کرکٹ کھیلتے ہوئے لوہے کی سلاخوں سے بنی وکٹوں کی طرز پر چھوٹے چھوٹے ''گول پوسٹ'' بنا کر دونوں جانب رکھے ہوئے تھے۔ ایران میں فٹ بال خاصا مقبول کھیل ہے اس کے علاوہ ایرانی پہلوان بھی عالمی سطح کے مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں۔ کرکٹ یہاں بالکل نہیں کھیلی جاتی۔ باوجود اس کے کہ ہاکی کے کھیل کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا آغاز سب سے پہلے ایران میں ہوا تھا آج کل ایران میں ہاکی شاید ہی مقامی سطح پر کھیلی جاتی ہو اور بین الاقوامی سطح پر ایران کی ٹیم نے ٹورنامنٹ میں حصہ نہیں لیا۔ شام کی اذان ہو رہی تھی جب ہم ایک بس سٹینڈ پر پہنچے۔ وہاں سٹینڈ خالی تھا مگر مسافر خواتین سمیت قطار بنائے انتظار میں کھڑے تھے یعنی پاکستان کے بس سٹینڈز کے برعکس یہاں بس میں جگہ حاصل کرنے کے لئے دھکم پیل یا ہلڑبازی نہ تھی اور نہ پسند کی جاتی ہے۔ بسیں سٹینڈ پر رک گئیں اور ہمیں پیدل چل کر شہزادہ عبدالعظیم رضی اللہ عنہ جو سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے فرزند تھے کے مزار پر پہنچنے میں دس پندرہ منٹ لگے۔ اسی چار دیواری میں ایک قبرستان تھا جسے حکومت نے مسمار کر کے ہموار پختہ صحن بنا دیا ہے اور جن کی قبریں یہاں موجود ہیں ان کے ناموں کی تختیاں پیروں تلے ہم پڑھتے تو اس سے پاؤں بچانے کی کوشش کرتے مگر تختیاں اتنی قریب اور زیادہ تعداد میں تھیں کہ ہم نے نیچے دیکھنے کی بجائے سامنے اور اردگرد دیکھنا شروع کر دیا۔

مقامی خواتین وحضرات کی اچھی خاصی تعداد یہاں موجود تھی اور لوگ آ جا رہے تھے۔ عشاء کے وقت ہم واپس بس سٹینڈ آ گئے اور بس میں سوار ہونے سے پہلے میں نے مشترکہ کھاتہ میں سے پیپسی کی ٹن پیک اور کھانے کے لئے بیکری کا کچھ سامان لے لیا۔ جو راستے

میں ہم نے کھایا پیا۔ رات کے سفر میں سونے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا کیوں کہ تہران سے نکلنے کے بعد اردگرد دور دور تک اندھیرا تھا۔ جن حضرات نے ابھی رات کا کھانا کھانا تھا ان کے مطالبہ پر رات 10 بجے سڑک کے کنارے ایک ہوٹل پر گاڑیاں روکی گئیں۔ ہوٹل کافی بڑا تھا اردگرد چار پانچ اور بھی بسیں کھڑی تھیں جن کے مسافر وہاں کھانا کھا رہے تھے اس لئے جگہ بھی کم تھی اور کھانا بھی ختم ہو رہا تھا ایسے میں جس کو جو کچھ اور جتنا ملا کھا لیا۔ ہم تو پہلے ہی تہران میں پیٹ پوجا کر چکے تھے اس لئے اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے۔ ایک ایرانی ڈرائیور جو انگریزی جانتا تھا اس نے ہمیں مخاطب کیا اور پوچھا:

''پاکستان سے آئے ہیں؟''

جواب اثبات میں پا کر اس نے سوال کیا:

''ایران کے لوگ کیسے لگے؟''

''لوگوں کا تو زیادہ پتہ نہیں البتہ یہاں کے ٹرانسپورٹر کی زبان ہے نہ دین ایمان، جو کرایہ طے کریں گے بعد میں اس سے زائد مانگنا شروع کر دیتے ہیں یہ زیادتی ہے اور یہ لوگ غیر ملکی مسافروں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں''۔

میری اس ''چڑھائی'' سے ایرانی کھسیانا سا ہو گیا اور ہاتھ ملا کر نکل گیا۔

سفر کے دوران دور آسمانی بجلی چمکتی تو پہاڑوں کا سلسلہ جو ہمارے ساتھ ساتھ تھا اندھیرے میں نمایاں نظر آنے لگتا۔ جس سیٹ پر میں بیٹھا تھا وہاں کا شیشہ ''لوز'' تھا اور تھوڑا سا کھلنے پر باہر سے سرد ہوا اندر آتی تھی جب تک میں جاگتا رہا وقفے وقفے سے شیشہ بند کرتا رہا مگر جب نیند آ گئی تو سرد ہوا لگنے سے میرا بایاں کندھا اور بازو ''سن'' ہو گئے اس کا اندازہ مجھے اچانک آنکھ کھلنے پر ہوا۔ میں نے شیشہ بند کرنے کی ڈیوٹی دوبارہ شروع کر دی۔ ایک ویرانے میں دوران سفر صبح کی پو پھوٹنے لگی۔ سب لوگ فجر کی نماز کے لئے پانی دیکھ کر بسوں سے نیچے اُترے مگر مجھے سردی لگنے سے طبیعت کی خرابی محسوس ہو رہی تھی اس لئے اندر ہی بیٹھا رہا۔

بچے دو ہی اچھے

صبح 10 بجے جب بھوک نے سب کو پریشان کیا تو ایک ہوٹل پر بس رکی۔ ہم سب نیچے اترے ہمارے علاوہ یہاں اور کوئی کھانا کھانے والا نہیں تھا۔ پتہ کیا تو آملیٹ اور دال چاول وغیرہ دستیاب تھے۔ حسب دستور کاؤنٹر پر رقم دے کر پلاسٹک کے گول ٹوکن لئے جن کو باورچی کے حوالے کر کے کھانا لیا اور میز پر بیٹھ کر کھانے لگے۔ ہوٹل میں خاندانی منصوبہ بندی کے حوالے سے رنگین پوسٹر لگے تھے جن پر بچوں کی تصویر تھی اور فارسی میں درج تھا ''بچے دو ہی اچھے''۔ ہم پاکستانیوں کے لئے یہ لمحہ فکر ہے کہ ایران جیسے رقبہ کے لحاظ سے ہم سے کہیں بڑے ملک جس کی آبادی تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ ہے میں بہبود آبادی کا شعور صرف حکومتی سطح پر ہی نہیں بلکہ شخصی سطح پر بھی نظر آتا ہے اور کسی بھی فیملی میں دو یا تین سے زیادہ بچے نہیں ہوتے۔ ایران کا رقبہ 16,48000 مربع میل اور آبادی تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ ہے۔

ساتھ والی میز پر ایک ساتھی چھوٹے سے برتن میں چٹنی نما چیز کھا رہے تھے میں نے پوچھا:

''یہ کیا ہے؟''

''مزیدار چٹنی ہے'' جواب ملا۔

''کہاں سے لی؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''جہاں سے کھانا ملتا ہے'' جواب میں دوست نے بتایا۔

میں نے ساتھ بیٹھے عارف کو فرمائش کی کہ وہ چٹنی لے کر آئے۔ اس نے ایرانی لڑکے کو لاکھ کہا کہ وہ اسے چٹنی دے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس نے ٹیبل پر واپس آ کر بتایا تو دوسری ٹیبل پر بیٹھے راشد نے بات سنی اور پوچھا:

''کیا وہ لڑکا چٹنی نہیں دے رہا؟''

''ہاں یار'' میں نے کہا۔

''ابھی مل جائے گی'' راشد نے اعتماد بھرے لہجے میں جواب دیا۔

وہ اٹھا اور کاؤنٹر پر ہوٹل کے مالک کے پاس گیا اور کہا ''چٹنی چاہئے''۔ ایرانی نے کاغذ کی چٹ پر لکھ کر دیا اور جب یہ ''پرزہ'' باورچی خانے والے لڑکے کو راشد نے تھمایا تو اس نے چٹنی دے دی جو کھانے میں واقعی مزیدار تھی۔ میں نے راشد سے پوچھا ''کاؤنٹر والا شخص تمہاری بات رقم کے بغیر کب سے ماننے لگا؟'' اس نے بتایا کہ جب وہ ہوٹل میں داخل ہو کر اس کے پاس گیا تو اس نے منہ بنا رکھا تھا میں نے پوچھا: ''کیا ہوا؟''

''سر میں سخت درد ہے'' اس نے بمشکل جواب دیا میں نے اسے اپنے پاس سے درد ختم کرنے کی گولی دی جو اس نے کھائی ہے تو وہ اب ٹھیک ہے اسی لئے اس نے ہمیں فوراً چٹنی کی چٹ دے دی۔

راستے میں چیک پوسٹوں کے علاوہ ایک آدھ اور جگہ رکتے ہوئے ہم سہ پہر 4 بجے ''مشہد'' شہر پہنچ گئے جہاں بس اسٹینڈ پر ہمیں اتار دیا گیا۔ منتظمین شہر میں رہائش کے لئے ہوٹل کا انتظام کرنے گئے اور گھنٹہ بھر کے بعد واپس آئے تو سوزوکی ''لوڈر'' طرز کی ویگنوں میں سامان سمیت بیٹھ کر ہم رضا مارکیٹ کے مشرقی جانب واقع ہوٹل کے باہر پہنچ گئے۔ دوسری منزل پر ایک مرتبہ پھر چار بستر والا کمرہ ہمیں ملا۔ جس میں سامان رکھ کر کچھ دیر ستانے کے بعد حضرت امام رضا رضی اللہ عنہ کے مزار کی طرف چل پڑے۔ ہمارے ہوٹل کے ساتھ واقع رضا مارکیٹ جو کئی منزلہ ہے بہت بڑی مارکیٹ ہے اور اس میں ہزاروں دوکانیں ہیں۔ اس کی دوسری منزل پر آمدورفت کے لئے برقی سیڑھیاں لگی ہوئی ہیں۔ مارکیٹ کے اندر ہر قسم کی اشیاء جیولری سے لے کر کتابوں وغیرہ کی بے شمار دوکانیں موجود ہیں۔ مارکیٹ کے سامنے کشادہ چوک ہے اس میں سے گزرتے ہوئے ہم حضرت امام رضا رضی اللہ عنہ کے مزار کے داخلہ گیٹ پر پہنچے تو وہاں متعین نوجوانوں میں سے ایک نے جلدی جلدی ہماری تلاشی لی کیوں کہ اندر داخل ہونے والوں کا رش تھا۔ خواتین الگ گیٹ سے داخل ہو رہی تھیں۔ مزار

کی عمارت وسیع رقبہ پر مشتمل ہے اور مرکزی حصہ میں داخلہ کے لئے متعدد دروازے ہیں۔ یہاں جوتے رکھنے کا مسئلہ تھا۔ ہم میں سے دو باہر جوتوں کی نگرانی پر کھڑے ہو گئے۔ میں اور راشد مزار میں گئے تو وہاں زائرین کا اس قدر ہجوم تھا کہ قبر کی جالیوں کو چھونا کم از کم میرے لئے ناممکن تھا۔ راشد نے کوشش کی مگر وہ ہجوم میں گم ہو گیا۔ ایسے میں کئی نوجوان ایک دوسرے کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر جالیوں کے اوپری حصہ کو چھونے کی کوشش کرتے بھی نظر آئے اور یہی حال خواتین کے حصہ میں تھا۔ یہ منظر میں پندرہ بیس منٹ دیکھتا رہا اور میں نے جب محسوس کیا کہ یہاں رش میں کپڑے پھٹنے کا بھی قوی امکان ہے تو راشد کو میں نے کہا ''واپس چلیں جب رش کم ہوگا تب سکون سے حاضری دیں گے''۔ ہم باہر آئے تو عارف اور بشیر اندر چلے گئے۔ مزار کے احاطہ میں خواتین بڑی تعداد میں بیٹھی تھیں بعض کے بچے بھی ان کے ساتھ تھے، عجیب گہما گہمی تھی کوئی آ رہا تھا تو کوئی جا رہا تھا۔ جیسے ہی عارف اور بشیر واپس آئے ہم باہر بازار میں آ گئے۔ بازار میں مجھے جسمانی حرارت سی محسوس ہوئی۔ میں نے راشد کو بتایا تو اس نے ہاتھ لگا کر کہا ''ہاں یار'' تمہیں تو بخار ہے۔

میں نے کہا کہ مجھے نقاہت سی محسوس ہو رہی اور زیادہ دیر کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ہوٹل جا کر آرام کروں۔ میں سیدھا ہوٹل آیا اور میرے پاس کچھ گولیاں تھیں جو میں نے کھا لیں مگر تھوڑی ہی دیر میں معمولی حرارت تیز بخار میں بدل گئی۔ جب راشد وغیرہ کمرہ میں آئے تو میرا جسم بخار سے پھنک رہا تھا۔ دو گھنٹے بعد دوائی کے اثر سے بخار اترا تو کھانے کے لئے ہم بازار آ گئے یہاں ہم نے پہلے ہی ایک ہوٹل دیکھ لیا تھا جس کے اردگرد دو رہائشی ہوٹل تھے جہاں کافی تعداد میں پاکستانی بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہاں کباب اور ایرانی روٹی کا بہت مزا آیا۔ سفر چاہے جتنا مرضی آرام دہ ہو اس کی اپنی تھکاوٹ ہوتی ہے اور اس وقت سب نے اسی تھکاوٹ کے باعث کھانا کھانے کے بعد ہوٹل کا رخ کیا اور بستر پر لیٹ کر کمبل اوڑھ لئے کیوں کہ رات کے وقت ''مشہد'' میں دن کے مقابلہ میں ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔

امام رضا رضی اللہ عنہ کے مزار پر

الصبح بیدار ہو کر فجر کے وقت حضرت امام رضا رضی اللہ عنہ کے مزار کا رخ کیا۔ چند اور ہمسفر بھی ساتھ تھے ہمارا خیال تھا کہ اس وقت مزار میں رش کم ہوگا اور وہاں توقع کے خلاف خواتین و حضرات کی بہت بڑی تعداد موجود تھی مگر گذشتہ روز کے مقابلہ میں ماحول خاصا پرسکون تھا۔ حاضری کی سعادت کے بعد کافی دیر تک وہاں رہے۔ بہت سے شناسا چہرے اردگرد نظر آئے یہ سب پاکستانی تھے کیوں کہ پاکستان سے ایران جانے والے زائرین کا سب سے زیادہ قیام ''مشہد'' میں حضرت امام رضا رضی اللہ عنہ کے مزار پر ہوتا ہے۔ مزار کے مرکزی حصہ میں داخلہ کے لئے دس دروازے ہیں جن میں سے دائیں ہاتھ کے کچھ دروازے خواتین کے لئے مخصوص ہیں۔ پاکستانی خواتین اپنے لباس سے ایرانی خواتین کے درمیان دور سے ہی پہچانی جاتی تھیں۔ میں ہوٹل آیا تو باقی ساتھی ہوٹل کے مشترکہ باتھ روم جو ایک فلور کے لئے تھا سے ٹھنڈے پانی سے ہی نہا چکے تھے۔ حتیٰ کہ ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ایرانی خواتین بھی اسے استعمال کرتی تھیں۔ میری چونکہ گذشتہ روز طبیعت خراب تھی اور اب پھر سے حرارت محسوس ہو رہی تھی اس لئے میں نے سوچا کہ گرم حمام میں نہانا ٹھیک رہے گا۔ ہوٹل کے استقبالیہ میں ہمارے اور ہمسفر بھی اکٹھے تھے میں نے اپنے نہانے کا ذکر کیا تو ایک دوست نے بتایا کہ ساتھ ہی گلی میں ہوٹل ہے جہاں گرم پانی سے نہانے کا انتظام ہے۔ وہاں پہنچا تو کاؤنٹر پر بوڑھا ایرانی بیٹھا تھا۔

میں نے اسے کہا ''غسل''؟

''50 تومان'' اس نے جواب دیا۔

میں نے جیب سے نوٹ نکال کر اسے تھما دیئے تو اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا کہ انتظار

کرو۔ سامنے سیڑھیوں کے ساتھ باتھ روم تھا جہاں سے دس منٹ بعد چہرہ نقاب سے ڈھانپے خاتون نکلی اور تیزی سے کمروں کی طرف چلی گئی۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ''ایرانی بابے'' نے مجھے اشارہ کیا۔ میں باتھ روم میں گیا تو تہران کی طرح اس کے بھی دو حصے تھے پہلا کپڑے وغیرہ رکھنے کے لئے جب کہ دوسرے میں شاور اور ٹونٹیاں تھیں جن میں تیز گرم پانی آ رہا تھا۔ مشہد میں بھی غسل کا ریٹ تہران والا ہے یعنی تقریباً 5 روپے میں۔

مشہد میں ہمارا دو رات کا قیام تھا اور اس دوران امام رضا ؒ کے مزار پر حاضری کے علاوہ کہیں اور جانے کا پروگرام نہیں تھا بلکہ تمام حضرات کو شاپنگ کے لئے وقت ملا تھا۔ کراچی سے ہمارے ساتھ جو میمن خواتین وحضرات تھے وہ پورے سفر میں خالی بیگ لئے پھرتے رہے جس کی ہمیں سمجھ ''مشہد'' پہنچ کر آئی جب انہوں نے شاپنگ کر کے انہیں بھر لیا۔ حاجی ابراہیم اپنی بیگم کے ہمراہ پلاسٹک کی ٹوکریاں وغیرہ اٹھائے ہوٹل میں آئے تو ان سے سلام دعا ہوئی۔ میں نے پوچھا ''اس قسم کی خریداری تو پاکستان میں بھی کی جا سکتی ہے پھر آپ یہاں سے سامان لے جانے کی زحمت بھی اٹھائیں گے''۔ کہنے لگے ''بھئی کیا کریں بیگم کی ماننا پڑتی ہے بازار میں کہہ دیتی ہے کہ یہ بھی خریدنا ہے وہ بھی، تو ہم خاموشی سے پیسے ادا کرتے جاتے ہیں۔''

شاپنگ میں ہمارا لیڈر راشد تھا۔ چیزیں ہم پسند کرتے اور ریٹ وہ طے کرتا تھا۔ مشہد کی مارکیٹ لاہور کی شاہ عالم مارکیٹ جیسی ہے۔ سامان سے بھری ہوئی دکانیں اور پررونق بازار ہیں۔ جرسیاں اور سوئیٹر زیادہ تر ہم نے حسن نامی ایک نوجوان دکاندار سے خریدے جو اُردو بھی بولتا تھا۔ اشیاء کی تعداد پوچھتے ہوئے کہتا ''کتنے دانہ'' اور جب ہم اس کے بتائے ہوئے ریٹ سے کم پیسے دیتے تو کہتا ''خدا قسم خسارہ ہے''۔ ہمارے بیشتر ساتھی ایرانی کمبل سستے دیکھ کر دھڑا دھڑ خرید رہے تھے کیوں کہ ڈبل کمبل ساڑھے پانچ سو روپے میں مل جاتا تھا۔ پاکستان سے چلتے وقت مجھے ایک دوست نے کمبل کے لئے روپے دیئے تھے ایک تو مجھے جاپانی کمبل کے مقابلہ میں یہ ایرانی کمبل پسند نہیں آئے دوسرا میری طبیعت خراب تھی اور

واپسی پر ہر کسی کو اپنا سامان خود اٹھا کر چلنا تھا اور پیش آمدہ تکلیف کے پیش نظر میں نہ صرف اپنے لئے بلکہ پاکستانی دوست کے لئے بھی کمبل خرید نہ سکا۔ البتہ چھوٹی موٹی اشیاء جو تحفے تحائف کے طور پر دی جاسکتی تھیں خریدیں۔ دوپہر کا کھانا بازار میں کل والے ہوٹل سے کھالیا اور مجھے ایک بار پھر بخار شروع ہوگیا اور سانس لینے میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔ میں نے ہوٹل آ کر اپنے پاس موجود گولیاں دوبارہ لے لیں اور لیٹ گیا مگر سردی بہت محسوس ہو رہی تھی۔ شام سے ذرا پہلے بخار اترنے پر طبیعت بحال ہوگئی۔ میں نے عارف سعید کو کہا کہ کسی میڈیکل سٹور پر چلتے ہیں کیوں کہ کچھ ٹیکوں کا پتہ کرنا تھا جو پاکستان میں ملتے نہیں تھے اور اگر تھے تو بہت مہنگے اور ایران میں ان کے بارے میں پتہ چلا تھا کہ یہاں بہت سستے ملتے ہیں۔ ہم باہر آئے اور گھوم کر رضا مارکیٹ کے دوسری جانب گئے تو وہاں کافی بڑا میڈیکل سٹور تھا جس پر دوائیاں فروخت ہونے کے طریقہ کار کا میں نے کچھ دیر جائزہ لیا۔ وہاں نسخے کے بغیر کوئی دوائی دی نہیں جا رہی تھی اور خریدار بھی نسخہ دے کر آرام سے کھڑے یا بیٹھے تھے اور کوئی جلدی کی بات ہی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں بات نہیں بنے گی لیکن میرے پاس بھی پاکستانی ڈاکٹر کا نسخہ تھا۔ میں نے سوچا ''ٹرائی'' کرنے میں کیا حرج ہے؟ میں نے کاؤنٹر پر نسخہ دیا اور ٹیکوں کا کہا تو دکاندار نے کہا کہ اس کے پاس یہ ٹیکے نہیں ہیں یہ فارمیسی سے ملیں گے۔ اس نے فارمیسی کا پتہ بتایا اور ہم اس کا شکریہ ادا کر کے باہر سڑک پر آ گئے۔

ٹیکسی ڈرائیور کم ٹیچر سے ملاقات

ہم نے ایک ٹیکسی کو اشارے سے روکا اور ڈرائیور کو بتایا کہ ''فارمیسی'' جانا ہے اس نے کہا ''بیٹھو''۔ ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ سیٹ پر میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی تو اس نے پوچھا کہ پاکستان سے آئے ہو؟ میں نے اپنے سفر کی تفصیل بتائی تو وہ خوش ہوا اور اپنا تعارف کروانا شروع کر دیا کہ میں یہاں استاد ہوں اور ایک سرکاری سکول میں پڑھاتا ہوں لیکن تنخواہ میں گذارا نہیں ہوتا اس لئے ٹیکسی بھی چلاتا ہوں۔ اس نے اپنا سکول کارڈ بھی مجھے دکھایا اور میں اس کی باتوں کا جواب ''ہوں، ہاں'' میں دینے کے بعد سوچنے لگا کہ ''استاذ'' پاکستان ہی نہیں یہاں بھی پریشان ہیں۔ ایران میں تو تعلیمی اداروں میں چھٹیوں کی تعداد کا مجھے علم نہیں ہو سکا لیکن پاکستان میں تو استاد سال کے 365 دن میں سے 100 سے بھی کم دن پڑھانے نہیں صرف سکول آنے کا معاوضہ لینے کے باوجود پریشان رہتے ہیں۔

فارمیسی پہنچے تو اندر بڑی شاندار عمارت تھی اور مرد وخواتین مریض اپنے نسخے کاؤنٹر پر دے کر ادویات ملنے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ میں اپنا نسخہ لے کر استقبالیہ پر بیٹھے ایرانی کے پاس گیا اور انگریزی میں اسے بتایا کہ مجھے ٹیکے چاہئیں۔ اس نے مجھ سے تعداد پوچھی تو میں نے کہا 25 چاہئیں تو اس نے سامنے رکھے کمپیوٹر میں حساب کتاب کر کے قیمت ایرانی ریال میں بتائی اور جب مجھے رقم کی فوری طور پر سمجھ نہ آئی تو میں نے اسے کہا کہ ''کتنے پاکستانی روپے ہوں گے''۔ اس نے جو رقم بتائی وہ بہت زیادہ تھی اور اس سے کم قیمت پر تو یہ ٹیکے پاکستان میں بلیک مارکیٹ میں مل جاتے تھے۔ میں نے نسخہ واپس لیا اور شکریہ ادا کر کے باہر آ گیا۔ ٹیکسی وہیں کھڑی تھی کیوں کہ ہم نے اسے واپس لے کر جانے کا بھی کہا تھا۔ جہاں سے ہم ٹیکسی میں سوار ہوئے وہیں اس ''استاد ڈرائیور'' نے ہمیں اتار دیا۔ میں نے کرایہ دینے کے

لئے تمام جیبوں میں سے ایرانی کرنسی نکالی مگر وہ طے شدہ کرایہ سے کم نکلی۔ میں نے ڈرائیور کو 10 روپے کا نوٹ بھی دیا تو اس نے شکریہ کے ساتھ لینے سے انکار کر دیا اور ایرانی کرنسی لے کر چلا گیا۔

صبح ہمیں مشہد سے واپس زاہدان کے لئے روانہ ہونا تھا مگر منتظمین کو بسیں نہیں مل رہی تھیں۔ وہ دو بسیں جو ہمارے لئے زاہدان سے مشہد آ رہی تھیں کو پولیس نے پکڑ لیا تھا کیوں کہ بس والوں نے اندر سگریٹ چھپا رکھے تھے۔ ایران میں اشیاء کی نقل وحرکت مسافر بسوں کے ذریعے سختی سے منع ہے اور اس قسم کی اشیاء مال برداری کے لئے مخصوص ٹرانسپورٹ پر ایک جگہ سے دوسری جگہ لائی جا سکتی ہیں جن کی راستے میں سخت چیکنگ ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ہمارا مشہد میں قیام ایک دن اور بڑھ گیا۔ شام کو میں نے اور عارف نے پتہ کیا کہ یہاں نزدیک کوئی ہسپتال ہے یا نہیں۔ ایک دوست نے بتایا کہ ہوٹل کے پیچھے والے بازار میں ہسپتال ہے۔ ہم دونوں پھرتے پھراتے وہاں پہنچ گئے۔ یہ امام رضا ؓ ڈسپنسری تھی اور دو منزلہ خوبصورت عمارت میں واقع تھی۔ گیٹ سے داخل ہوئے تو سامنے شیشے کے کاؤنٹر میں ادھیڑ عمر خاتون بیٹھی تھی۔ ہم سامنے ہوئے اور پوچھا ''ڈاکٹر صاحب'' اس نے ہم سے 5 تومان طلب کئے جو میں نے دے دیئے۔ خاتون نے مسکرا کر ایک چھپی ہوئی ٹکٹ دی جس پر ڈسپنسری کا نام اور نمبر درج تھا اور سیڑھیاں اوپر چڑھنے کے لئے رہنمائی کی۔ اوپر دائیں بائیں کمرے تھے اور دو تین چھوڑ کر ایک کے باہر کچھ خواتین لکڑی کے بنچ پر بیٹھی تھیں اور کمرہ کے گیٹ پر ایک خاتون سفید اوورکوٹ پہنے کھڑی تھی جو دروازہ کھول کر اندر جھانکتی اور جگہ خالی ہونے پر اگلے مریض کو اندر بھیج دیتی۔ میں اور عارف بھی بنچ پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد عارف کہنے لگا کہ مجھے بھی پیٹ میں تکلیف ہے میں نے بھی چیک اپ کروانا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ نیچے سے تم بھی ٹکٹ لے آؤ۔ اتنے میں میری باری آ گئی۔

میں اندر گیا تو چھوٹی مخصوص ایرانی داڑھی والے ڈاکٹر صاحب نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں نے اُردو میں بتایا کہ مجھے غالباً راستہ میں ٹھنڈی ہوا لگنے کی وجہ سے بخار اور چھاتی میں رکاوٹ

وغیرہ کی تکلیف مسلسل دو دن سے ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے میری بات سنی اور نسخہ لکھ کر مجھے دے دیا۔ اس سے پہلے انہوں نے نیچے سے ملنے والی ٹکٹ مجھ سے لے کر دراز میں رکھ لی تھی۔ میں نسخہ لے کر باہر آ گیا اور بائیں جانب واقع میڈیکل سٹور پر کھڑے شخص کو پرچی دکھائی تو اس نے کہا ''نیچے رقم جمع کراؤ''۔ نیچے خاتون نے 20 تومان لے کر مہر لگا دی اور میڈیکل سٹور سے مجھے دو انجکشن، ایک کھانسی کا شربت، 10 اینٹی باؤٹکس کیپسولز کا سٹرپ اور درد و بخار کی گولیوں کا ایک سٹرپ ہمراہ دو عدد سرنج مجھے پلاسٹک کے لفافہ میں ڈال کر دے دیا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہی پہلا کمرہ انجکشن لگوانے کا تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لئے رکا کیوں کہ عارف سٹور (ڈسپنسری) سے ادویات لے رہا تھا۔ اسے بھی ڈاکٹر نے ایک انجکشن لکھ کر دیا تھا۔ ہم دونوں انجکشن لگوانے والے کمرہ میں گئے۔ ادویات پر انگریزی میں بہت کم اور فارسی میں زیادہ لکھا ہوا تھا اور میڈیکل سٹور والا گولیاں لفافے میں ڈال کر اور پنسل سے کھانے کی ترتیب اور اوقات بھی لکھ کر دے رہا تھا اور تقریباً دو روپے میں ڈسپنسری سے ہمیں کم از کم 50 روپے کی ادویات دی گئی تھیں۔

ادویات لے کر ہم باہر نکلے تو بازار میں ایک جگہ پھلوں کی دکان تھی تمام پھل تازہ اور کھلے باہر رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے ایک کلو انگور 8 روپے میں لئے اور بازار میں ''مٹرگشت'' کے ساتھ انگوروں کا مزہ بھی لیتے رہے۔ دوسری جانب سے راشد اور بشیر بھی آ نکلے انہوں نے ہمیں پوچھا ''کہاں سے آ رہے ہو''؟ ہم نے ڈاکٹر کے پاس جانے کا قصہ قریبی چائے خانے میں بیٹھ کر انہیں بتایا۔ چائے خانہ میں حقے بھی تازہ کر کے اہل شوق کی میزوں پر پیش کئے جا رہے تھے۔ اس قسم کا رواج ترکی وغیرہ میں بھی ہے۔

واپسی سے قبل خریداری اور ''سیخ پا''

ڈاکٹر کی دوائی کھانے کے باوجود مجھے پھر بخار ہو گیا لیکن صبح جب بیدار ہوا تو طبیعت قدرے ٹھیک تھی۔ آج سہ پہر ہمیں ''مشہد'' سے واپس زاہدان جانا تھا جس کے لئے سواری کا بندوبست ہو گیا تھا۔ واپسی کی وجہ سے ایرانی کرنسی ہم خرچ کر چکے تھے۔ لیکن موقعہ غنیمت جان کر ہم نے بازار کا ایک چکر اور لگایا۔ حسن کی دکان سے میں نے اپنے لئے ایک ایرانی سلائی والی پینٹ خریدی لیکن اس کا سٹائل پاکستان سے ملتا جلتا تھا ورنہ ایرانی تو اکثر شلوار نما پینٹ ہی پہنے نظر آتے ہیں۔ میں نے ایک کاٹن شرٹ کا بھاؤ پوچھا تو وہ 200 روپے سے زیادہ تھا۔ یہ شرٹس مصر کی کاٹن سے بنی ہوئی تھیں۔ میں نے حسن کو کہا ''اس سے کم قیمت میں تو پاکستان میں اچھی شرٹ مل جاتی ہے یہاں سے مہنگی خریدنے کا کیا فائدہ؟'' اس نے کہا: ''کیا کریں ہماری خرید ہی اتنے کی ہے''۔ دوسرے سامان کی پے منٹ کے لئے ہمارے پاس ایرانی کرنسی نہیں تھی ہم نے حسن کو کہا ''کرنسی چینج کر دو'' اس نے اندر اپنے بھائی سے پوچھا ''کیا ریٹ ہے؟'' اس نے ریٹ بتایا تو ہم نے پاکستانی کرنسی کے بدلے ایرانی ریال حسب ضرورت اس سے لے لئے جو اس نے اندر کونے میں لے جا کر ہمیں دیئے کیوں کہ اس طرح کرنسی کا تبادلہ نہ صرف ایران بلکہ عراق میں بھی ہر جگہ ممنوع ہے۔ بازار میں چکر لگاتے ہوئے ہم نے چند ایک جگہوں سے چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں۔ کھانے کی طلب ہوئی تو ہم تکہ کباب بنانے کی ایک دکان جو حضرت امام رضا رضی اللہ عنہ کے مزار کے سامنے واقع تھی میں چلے گئے۔ دکان کے دروازے پر ایک شخص کلیجی اور بوٹی کی سیخیں لگا رہا تھا۔

میں نے یہ سوچ کر کہ یہاں فی نفر (فی آدمی) کے حساب سے کھانا ملتا ہے اس شخص کو کہا ''سہ کباب فی نفر''۔ میرا مقصد تھا کہ ایک کے لئے 3 سیخیں کافی ہوں گی۔ ہم چاروں

ایک میز پر جا کر بیٹھ گئے اور یخ پانی آہستہ آہستہ پی کر پیاس بجھائی۔ ہمارے سامنے بعد میں آنے والے لوگ کباب، سیخیں اور روٹی لے کر کھاتے جا رہے تھے مگر ہم انتظار میں بیٹھے تھے۔

تنگ آ کر میں نے بیرے کو ایک دو مرتبہ کہا ''ہمارا آرڈر بھی لاؤ، دوسروں کو جو بعد میں آئے ہیں لا کر دیئے جا رہے ہو''۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے صبر کرنے کو کہا۔ آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد وہ سیخوں کا گچھا دونوں ہاتھوں میں تھامے آیا اور لا کر ہماری میز پر رکھ دیں۔ ہم حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے کہ یہ کیا ماجرہ ہے؟ ہم نے اتنی سیخوں کا آرڈر ہی نہیں دیا۔ میں سیخیں لگانے والے شخص کے پاس گیا اور بارہ رکھ کر باقی واپس کر دیں۔ وہ کچھ بڑبڑایا مگر میں نے میز پر آ کر کھانا شروع کر دیا۔ دراصل وہ ''سہ'' کو ''سی'' سمجھا تھا جس کا مطلب 30 ہے اور اسی لئے اس نے اتنی سیخیں لگا کر بھیج دی تھیں۔ بعد میں ہم نے بیرے کو چار سیخیں اور لانے کو کہا تو اس نے ہمیں نظر انداز کر دیا کیوں کہ سیخیں واپس کرنے کی وجہ سے وہ ''سیخ پا'' تھے۔ ہوٹل واپس آتے ہوئے ہم نے پیراشوٹ کا ایک ایک بریف کیس نما بیگ خریدا جو ہمیں 250 روپے میں سستے داموں مل گئے۔ اس میں ہمارا سامان آسانی سے پیک ہو سکتا تھا۔ ہم چاروں میں سے عارف سعید نے سب سے زیادہ خریداری کی تھی اور کمزور سا جسم رکھنے والے اس دوست نے اپنے وجود سے تین گنا سامان جمع کر لیا تھا۔

چڑیا فال اور خوشبو دار زیرہ

بازار سے واپسی پر ہوٹل سے تھوڑا پہلے چوک میں ایک خاتون بیٹھی تھی جس طرح ہمارے ہاں فال والے طوطے لے کر بیٹھے ہوتے ہیں جو کارڈ اٹھا کر دیتے ہیں جن پر قسمت کا حال لکھا ہوتا ہے۔ لیکن یہاں کارڈ اٹھانے کے لئے طوطے کی بجائے ننھی ننھی چڑیاں بیٹھی تھیں جنہیں اس مقصد کے لئے سدھایا گیا تھا۔ دوسرا آگے فٹ پاتھ پر ایک بھرے جسم کی نوجوان خاتون اپنے سامنے سیاہ زیرہ رکھے بیٹھی تھی۔ خاتون خاصی تیز تھی میرے کہنے پر باقی دوست بھی اس کے پاس رکے تو اس نے چٹکی بھر کر زیرہ ہم میں سے ہر ایک کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھوں میں خوبصورت مہندی لگی ہوئی تھی جسے دیکھ کر بشیر اعوان نے پھبتی کسی کہ اس سے تو زیرہ ضرور خریدنا چاہئے لیکن وہ خاتون پاس کھڑے گاہکوں کو توجہ دینے کی بجائے لاپرواہی سے آواز لگا کر باقی لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سیاہ زیرہ کی خوشبو بہت اعلیٰ تھی اور شاید پاکستان میں زیرہ کی یہ خوشبو ملاوٹ کی وجہ سے ناپید ہو چکی ہے۔ خاتون سے میں نے قیمت پوچھی تو آدھ پاؤ وزن کا زیرہ جو اس نے پلاسٹک کے چھوٹے لفافوں میں بند کر کے رکھا تھا کی قیمت 50 تومان بتائی اور 100 تومان میں اس نے 3 لفافے پکڑا دیئے۔

ہوٹل پہنچ کر جلدی جلدی اپنا سامان پیک کیا کیوں کہ ہوٹل والے ہمارے منتظمین کو ہوٹل خالی کرنے یا مزید کرایہ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ سب حضرات اپنا اپنا سامان لے کر نیچے استقبالیہ میں آ گئے اور مشکل یہ تھی کہ ہوٹل کے سامنے ''ون وے'' روڈ تھی اور یہاں پر بسیں کھڑی کرنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ مجھے بخار نے پھر آن لیا۔ مجبوراً اپنا بریف کیس اور بڑا بیگ

اٹھایا اور پیدل رضا مارکیٹ کے دوسرے سرے پر چوک میں آدھ گھنٹے میں پہنچے جہاں بسیں ندارد۔ عصر سے لے کر شام گئے تک سامان رکھے وہیں کھڑے اور بیٹھے رہے اور عشاء کے وقت بسیں آئیں جن میں بیٹھ کر سکون کا سانس لیا۔ میرا بخار ایک مرتبہ پھر اُتر گیا تھا۔ رات بھر سفر جاری رہا ایرانی خواتین کا بیگ ہم نے موجودہ بس والوں کو دے دیا جو خدارا وغیرہ کو جانتے تھے۔

پاکستان زندہ باد کے نعرے

مشہد سے زاہدان کا فاصلہ 14 گھنٹے میں طے ہوا اور اگلے دن 11 بجے بسوں میں سے تفتان بارڈر پر پاکستان کی سرحد نظر آئی تو اہل ذوق جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور نعرۂ تکبیر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند کئے۔ زاہدان پہنچنے پر واقعی حالت یہ ہوگئی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ اب جلد سے جلد پاکستان پہنچ جائیں۔ سفر میں ایک عجیب غریب الوطنی محسوس ہوتی تھی اور سب پاکستان میں داخل ہونے کے لئے بے تاب تھے۔ ایرانی امیگریشن کاؤنٹر سے ہم نے خروج کی مہریں اپنے اپنے پاسپورٹ پر لگوالیں اور اونچی چھت کی انتظار گاہ میں سب لوگ اپنے سامان کی چیکنگ کے انتظار میں تھے مگر ایرانی حکام کھانے اور نماز کے وقفہ پر تھے۔ میری طبیعت سفر میں ایک دو مرتبہ خراب ہوئی، بخار ہوا اور دوا لینے سے کچھ دیر بعد اُتر گیا۔ انتظار گاہ میں بیٹھے اچانک مجھے تیز بخار ہوگیا اور اس کی شدت 120° سے 104° تک تھی۔ ڈی آئی خاں کے سید نزاکت گیلانی نے میری بے چینی دیکھ کر پوچھا تو میں نے ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے جب محسوس کیا کہ مجھے بہت تیز بخار ہے تو وہ فوراً تولیہ ٹھنڈے پانی سے بھگو کر لے آئے اور میرے ہاتھ پاؤں اور چہرے پر ٹھنڈے پانی سے بھرے کپڑے رکھ کر رگڑے۔ انہوں نے پوری سنجیدگی سے بخار کی شدت کم ہونے تک میری مدد کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس نیکی کا اجر عطا فرمائے اور میں ان کا احسان مند ہوں۔ گھنٹہ بھر میں میری طبیعت بحال ہوئی مگر بہت زیادہ پسینہ آنے کی وجہ سے نقاہت محسوس ہونے لگی۔ اتنے میں ایرانی حکام میں سے ایک نے آ کر سامان چیک کئے بغیر ہی ہمیں جانے کی اجازت دی۔ اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا تو سجدہ شکر ادا کیا اور ایک راحت اور اطمینان کا احساس ہوا۔ یہاں کسٹم حکام کے پاس ہمیں سامان چیک کروانا تھا۔ میرے پاس تو فالتو چیز ہی نہیں تھی پھر بھی

وہ سب کچھ کھول کر دیکھ سکتے تھے مگر جیسے ہی میں نے اپنا بریف کیس میز پر رکھا کسٹم کے سپاہی نے پوچھا ''کہاں کے رہنے والے ہیں؟'' میں نے کہا ''لاہور''۔ اس نے کہا ''ٹھیک ہے جائیں''۔ سب نے یہ مرحلہ بھی طے کرلیا تو کوئٹہ جانے کے لئے بس میں سوار ہو کر ہم اگلی صبح 11 بجے کوئٹہ ریلوے اسٹیشن پہنچے جہاں گاڑی لاہور جانے کے لئے تیار تھی۔ مگر میں نے چلتن میں لاہور سے کوئٹہ سفر کے تلخ تجربہ کے بعد فیصلہ کر رکھا تھا کہ ٹرین سے ہرگز نہیں جاؤں گا۔ امجد چشتی اور ان کے عزیز یٰسین چاند نے بائی ایئر لاہور جانا تھا میں بھی بات کر کے ان کا ہمسفر ہو گیا جنہوں نے دوڑ دھوپ کر کے اگلی صبح کی فلائٹ سے سیٹیں بک کروالیں اور رات کوئٹہ ہوٹل میں بسر کرنے کے بعد ہم بائی ایئر 10 بجے لاہور پہنچ گئے۔

لاہور ریلوے اسٹیشن کا چیکر

میرا سامان والا بڑا بیگ راشد کے پاس تھا جنہیں بذریعہ ٹرین شام 4 بجے لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچنا تھا۔ میں بھی وہاں چلا گیا ٹرین آئی تو اگلے ڈبوں میں ہمسفر حضرات موجود تھے لیکن ان کے اترنے سے پہلے وہاں چیکر صاحب بھی پہنچ گئے۔ راشد جب دو ایک جیسے بیگ لے کر نیچے اترا تو چیکر نے روک لیا اور کہا کہ سامان زیادہ ہے وزن ہوگا۔ میں پاس کھڑا تھا راشد نے کہا ''ایک بیگ ان کا ہے'' چیکر نے مجھے ٹکٹ دکھانے کو کہا۔ میں نے کہا ''میں تو نے اس گاڑی سے آیا ہی نہیں''۔ راشد نے مداخلت کرتے ہوئے چیکر کو بتایا کہ ''یہ تو بائی ایئر آئے ہیں''۔ اس پر چیکر نے مجھ سے پلیٹ فارم ٹکٹ مانگ لی جو مجھے خریدنے کا کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔ میں نے جواباً اسے اپنا پریس کارڈ دکھایا تو وہ غصے میں آ گیا اور کہنے لگا ''میرے پاس بھی بڑے بڑے اخبارات کے کارڈ ہیں''۔ میں نے کہا ''ہوں گے میں کیا کروں''۔ میں نے قلی کو کہا ''میرا سامان اٹھاؤ'' وہ چلنے لگا تو چیکر نے پھر روک لیا اور کہا ''اس کا وزن ہوگا''۔ میں نے کہا ''ٹھیک ہے''۔ عارف سعید جس کے پاس اس کے وجود سے تین گناہ زیادہ سامان تھا اس کی بدقسمتی کہ منتظمین نے کوئٹہ ریلوے اسٹیشن پر جلدی میں اسے ملتان تک کی ٹکٹ پکڑا دی۔ اس نے پریشانی میں اسے دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی اور لاہور ریلوے اسٹیشن پر چیکر نے پکڑ لیا۔ عارف کا سامان بھی ہمارے ساتھ چیکر ویٹ مشین تک لے آیا۔ میرے والا بیگ اس نے ویٹ مشین پر کھوا کر اتار لیا اور مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگا: ''یار رعایت لینی ہو تو خاموشی سے کہہ دیا کرو، اب آرام سے چلے جاؤ''۔ میں نے کہا ''ٹھیک ہے'' اور راشد کے ساتھ ہم سامان اٹھائے قلی کے ساتھ سڑک پر آ گئے۔

عارف سعید نے بعد میں خط میں بتایا کہ چیکر نے غلط ٹکٹ اور سامان زیادہ ہونے پر اس

سے 300 روپے جرمانہ وصول کیا تھا۔ میں اور راشد ٹیکسی لے کر بیگ اس کے اوپر باندھنے کے بعد تھوڑی دور گئے تھے کہ راشد کو کچھ یاد آ گیا۔ ''یار ایرانی کولر وہیں سڑک پر رہ گیا۔'' راشد پریشانی میں بولا۔ ڈرائیور نے ہمارے کہنے پر فوراً گاڑی واپس کی مگر اس جگہ کچھ نہ تھا۔ راشد کا چہرہ اتر گیا اور کہنے لگا: ''یار عجیب بات ہے تفتان سے اٹھا کر کولر سینکڑوں کلومیٹر ساتھ لے آیا اور اپنے شہر میں پہنچ کر گم ہو گیا''۔ میں نے اسے صبر کرنے کو کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اس طویل ترین اور یادگار سفر کے بعد بخیریت گھر پہنچ کر سجدہ شکر ادا کیا جبکہ تھکاوٹ دور کرنے اور نیند پوری کرنے میں کئی دن لگ گئے۔

عراق میں مزارات کا احوال

عراق کا شمار دنیا کے قدیم ممالک میں ہوتا ہے جہاں ہزاروں سال قبل بھی تہذیب و تمدن کا دور دورہ رہا ہے۔ علم وفضل جن خطوں میں خصوصیت سے پھلا پھولا ان میں بغداد سرفہرست رہا ہے۔ بڑے بڑے دانشوروں، طبیبوں، نکتہ وروں، فلسفیوں، آئمہ اور حکمرانوں نے اسی دھرتی سے جنم لیا اور شہرت دوام پائی۔ عراق کی سرزمین کا سب سے بڑا اعزاز ''انبیاء اور اولیاء'' کی سرزمین کہلانا ہے۔ عراق میں بے شمار چھوٹے بڑے شہروں میں لاکھوں نبی، صحابی، غوث، قطب، ولی، امام اور بزرگ ہستیاں آسودہ خاک ہیں۔ صرف بغداد شہر میں ایک سروے کے مطابق 10982 متبرک اور بزرگ ہستیوں کے مزارات واقع ہیں۔ خانہ کعبہ اور مسجد نبویؐ کے بعد پوری دنیا کے مسلمانوں کو ان عظیم ہستیوں سے فکری اور مذہبی عقیدت ہے۔ مختلف شہروں میں ان مزارات و مذہبی مقامات کا تذکرہ وتفصیل درج ذیل ہے:

مزار غوث اعظم رضی اللہ عنہ:

بغداد کے ''الروسفا'' علاقہ میں مزار غوث اعظمؒ جسے ''القادریہ'' بھی کہتے ہیں واقع ہے۔ تاریخی اعتبار سے ''مزار القادریہ'' دراصل ایک عظیم اسلامی درسگاہ تھی جسے حضرت امام حنبل رضی اللہ عنہ کے مقلد جید اور باعمل عالم شیخ المبارک بن علی بن حسین ابوسعید المکرّمیؒ نے تعمیر کروایا تھا۔ ان کا انتقال 513ھ میں ہوا جس کے بعد ان کے مرید شیخ عبدالقادر بن موسیٰ بن عبداللہ گیلانیؒ جو وقت کے بہت بڑے امام تھے نے درسگاہ کا نظم ونسق سنبھالا اور اسے وسیع کیا بعد میں آپ اپنے علم وفضل اور حلقہ ارادت کی وجہ سے غوث اعظم کہلائے۔ شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کے مزار اور مسجد کا رقبہ خاصا اور آبادی کے درمیان واقع ہے۔ مزار اور مسجد مختلف مراحل میں تعمیر کئے گئے۔ 941ھ میں مسجد کے مرکزی حصہ پر عظیم الشان گنبد تعمیر کیا گیا جو

اب تک عراق میں اینٹوں اور جپسم سے تعمیر ہونے والا واحد اور سب سے بڑا گنبد ہے۔ مزار غوث اعظمؒ پر گھڑیال 1316ھ میں تعمیر کیا گیا اور مینار بغداد میں پہلے سے بنے ''الشکلا'' گھڑیال سے مشابہ ہے۔ 1970ء میں مزار کی تزئین و آرائش اور مرمت کا منصوبہ بنایا گیا جس کے دوران نیلے اور سفید گنبدوں کی تزئین و آرائش کے علاوہ نئے گنبد بھی بنائے گئے جن پر اسلامی طرز تعمیر اور نقاشی کے کام کا بہترین مظاہرہ کیا گیا جو اس سے پہلے عراق میں نہیں ہوا تھا۔ عراق کے سابق صدر صدام حسین نے اس کا کام میں خصوصی دلچسپی لی اور کام مکمل ہونے پر خود اسے دیکھا اور تسلی بخش قرار دیا۔ یہاں اب اسلامی علوم کی درسگاہ اور بہت بڑی لائبریری بھی ہے۔

مزار حضرت امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ:

بغداد کے علاقہ ''الکاظمیہ'' عراق کا سب سے قدیم قصبہ ہے یہاں حضرت امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کا مزار مبارک ہے۔ بغداد کی آبادکاری سے پہلے الکاظمیہ کو ''شینزی'' کہتے تھے جس کا عربی میں مطلب ''سیاہ فصل'' ہے۔ عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور نے 762ء میں جب بغداد کے سرکلر سٹی کی تعمیر شروع کی تو اس نے اپنے خاندان کے افراد اور رشتہ داروں کی تدفین کے لئے ایک خاص علاقہ مخصوص کیا، یہ علاقہ ''قریش قبرستان'' کے نام سے مشہور ہوا۔ یہاں دفن ہونے والوں میں جعفر المنصور کے صاحبزادے خلیفہ الامین اور ہارون رشید کی بیوہ زبیدہ خاتون بھی شامل ہیں۔ 799ء میں جب امام موسیٰ بن جعفر رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تو انہیں بھی یہیں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ الکاظم کے نام سے مشہور تھے۔ تاریخی طور پر عباسی خلیفہ المعتصم باللہ نے امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کے مزار کی تعمیر کا حکم دیا تھا اور دو گنبدوں کے علاوہ اِردگرد کی گیلریاں بنوائیں۔ تاہم 1515ء میں مزار کی تعمیر نو ہوئی اور وقت کے ساتھ ساتھ گیلریوں کی تعداد بڑھتی گئی اور متصل جگہ کو بھی مزار کے احاطہ میں شامل کرنا پڑا۔ اس وقت دو مرکزی گنبدوں کے اوپر دو دوسرے گنبد ہیں پر پوری طرح سونا لگا ہوا جب کہ اِردگرد چار بڑے اور چار ہی چھوٹے مینار ہیں جن کی اونچائی اچھی خاصی ہے۔ مزار کی مرکزی عمارت کے اِردگرد

خاصا وسیع صحن ہے جس میں سنگ مرمر لگا ہوا ہے پوری عمارت میں خوبصورت نقاشی نظر آتی ہے۔ مزار کی پرشکوہ عمارت کے مرکزی حصہ میں کاشی کاری کا کام اپنی مثال آپ ہے۔ اسی عمارت میں امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کے پوتے امام محمد الجواد رضی اللہ عنہ بھی مدفون ہیں جن کی وفات 834ء میں ہوئی تھی۔

حضرت امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کے مزار کے احاطہ میں دائیں دیوار میں حضرت امام ابویوسفؒ کا مزار ہے۔ آپ کا شمار حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ہونہار شاگردوں میں ہوتا تھا۔ آپ کے مزار سے ملحقہ خوبصورت مسجد بھی ہے۔

مزار حضرت امام ابوحنیفہؒ:

بغداد کے امام اعظم، امام ابوحنیفہؒ کا مزار انور ضلع ابوحنیفہ ''الاعظمیہ'' میں ''الخضر ان'' قبرستان میں واقع ہے۔ عباسی دور میں یہ علاقہ بغداد کا سب سے مشہور حصہ شمار ہوتا تھا۔ حضرت امام اعظمؒ کے مزار کا احاطہ کافی بڑا ہے مزار اور اس سے ملحقہ مسجد کی عمارت اسلامی طرز تعمیر کا عالی شان نمونہ ہے۔ مزار اور مسجد کے شمال میں بڑی سڑک ہے جبکہ جنوب میں قبرستان پھیلا ہوا ہے۔ آپؒ کے مزار کے گنبد پر نقاشی بہت خوبصورت اور دلآویز ہے۔ سلجوکی سلطان علب ارسلان کے دور 1067ء میں امام اعظم کے مزار کی وسیع پیمانے پر تعمیر ومرمت اور تزئین وآرائش الملک ابوسعید الخوارزمی نے کروائی اور ایک بہت بڑا گنبد بھی تعمیر کروایا تھا۔ موجودہ مسجد کا گنبد 1638ء میں تعمیر کیا گیا۔ مزار سے ملحقہ مسجد 1871ء میں تعمیر کی گئی اور 1903ء میں اس کی ازسرنو تعمیر ومرمت ہوئی جب کہ مرکزی دروازہ 1948ء میں بنایا گیا۔ مزار کے احاطہ میں شمال مشرقی کونے میں ایک بڑا مینار جس پر چاروں جانب گھڑیال لگے ہوئے ہیں۔ اسے مرحوم عبدالرزاق مصاحب الاعظمی نے 1958ء میں بنوایا تھا۔ مسجد کی دیوار کے ساتھ غلاف کعبہ کا ایک بڑا ٹکڑا شیشہ کے باکس میں محفوظ کر کے لگایا گیا ہے مزار کے اندر دیوار پر کاشی کاری بہت خوبصورت ہے۔ متعدد فانوس لگے ہیں جو روشن رہتے ہیں۔

مزار حضرت ابوالحسن نوریؒ:

الخضر ان قبرستان کے گرد آبادی کے درمیان حضرت ابوالحسن نوریؒ کا مزار واقع ہے جو بہت قدیم ہے مزار کے چھوٹے سے گنبد میں دراڑیں نمایاں ہیں قبر سادہ ہے جس پر سبز چادر بچھی رہتی ہے۔ مزار سے ملحقہ حویلی میں اور بھی کمرے ہیں جن میں لائبریری بھی ہے۔

مزار شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ:

بغداد کے متعدد ورکشاپس میں گھرے علاقہ میں سلسلہ سہروردیہ کے بانی شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کا مزار واقع ہے۔ تعمیر شدہ عمارت کے سامنے کھلی حویل ہے جس کو اکثر تالا لگا رہتا ہے۔ مزار کے احاطہ میں پہلے مسجد ہے اس کے ساتھ مزار ہے چھوٹے سائز کی قبر پر سبز چادر اور اردگرد لکڑی کا جنگلہ ہے جس کی چھت نہیں اور شمالاً جنوباً دو سبز پرچم بھی لگے ہیں۔ مزار کے ملحقہ اندر ہی شمال میں معتصم باللہ کی قبر ہے جو گمنام اور ویران ہے۔

مزار شیخ بہلول دانا الکوفیؒ:

بغداد ریلوے اسٹیشن کے بے آباد علاقہ میں ایک چاردیواری کے اندر حضرت شیخ بہلول دانا الکوفی ؒ کا مزار ہے۔ آپ بغداد کے بہت بڑے بزرگ تھے آپ دریائے دجلہ کے کنارے مجذوب حالت میں بیٹھے رہتے تھے۔ خلیفہ ہارون رشید اور اس کی بیگم زبیدہ خاتون کی آپ سے ملاقات اور جنت میں گھر بنانے کا واقعہ تاریخ کا حصہ ہے۔ حضرت بہلول دانا ؒ کے مزار کا دروازہ کھلنے پر یکدم اندر سے بھینی بھینی خوشبو پھوٹنے کا احساس ہوتا ہے اس کے بعد مزار کے اندر یہ احساس ختم ہو جاتا ہے۔ مزار کے ساتھ ہی دائیں جانب ایک کمرہ ہے جہاں سکھ مت کے بانی بابا گرونانک نے چلہ کاٹا تھا وہاں اس کی مسہری اور چند چیزیں ابھی تک پڑی ہیں۔

مزار حضرت یوشع بن نون علیہ السلام:

بغداد ریلوے اسٹیشن کے قریب قبرستان میں حضرت یوشع بن نون بن افرائیم بن

یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم کی قبر انور ہے۔ اس پیغمبر کی قبر پر تعمیر شدہ عمارت قدیم اور خستہ حالت میں ہے۔

مزار السید ابی احمد الغربیؒ:

بغداد ریلوے اسٹیشن کے قریب قبرستان میں مشرقی جانب ایک چاردیواری میں کھجور کے کافی درخت ہیں۔ احاطہ میں دو مزارات ہیں ایک السید ابی احمد الغربی ابن العزیز بن شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کا ہے جبکہ دوسرا مزار عبداللہ العابد الی زینب جو امام علی نقیؒ کی اولاد میں سے ہیں کا ہے۔

مزار حضرت جنید بغدادیؒ:

حضرت جنید بغدادی اور ان کے ماموں شیخ سری السقیطیؒ کے مزارات بھی بغداد ریلوے سٹیشن کے گرد ونواح میں ہیں۔ حضرت سری السقیطیؒ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور بزرگ گزرے ہیں اور حضرت جنید بغدادی جو شاہی پہلوان تھے۔ مشہور واقعہ تاریخ کا حصہ ہے کہ انہوں نے ایک سید زادے سے کشتی لڑی تھی اور ظاہری طور پر شکست کھائی جبکہ باطنی طور پر حضور نبی کریم ﷺ کی بشارت سے ولایت کے عہدہ پر فائز ہوئے تھے۔

مزار حضرت معروف الکرخیؒ:

بغداد میں ایک بڑے قبرستان میں حضرت معروف الکرخیؒ کا مزار ہے۔ آپ نے حضرت امام علی رضا رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ اہل عرب میں حضرت معروف الکرخی کا بہت احترام کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ آپ کے مزار پر مانگی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ مزار کی تزئین و آرائش خوبصورت منظر پیش کرتی ہیں۔ بائیں جانب سیڑھیاں نیچے جاتی ہیں جہاں پہلے چشمہ ہوا کرتا تھا۔ آپؒ اس سے پانی پیتے اور وضو کرتے تھے۔ چشمے کا پانی ذائقے کے اعتبار سے نمکین ہے۔

مزار حضرت داؤد طائیؒ:

حضرت معروف الکرخیؒ کے پیرومرشد حضرت داؤد طائیؒ کا مزار بھی اسی قبرستان میں

ہے۔ مزار کی عمارت زیادہ بڑی نہیں ہے۔ حضرت داؤد طائی کا سلسلہ نسب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔ آپ 163ھ میں فوت ہوئے۔

مزار ملکہ زبیدہ خاتون:

بغداد کا محلہ الشیخ معروف سماجی اعتبار سے غریبوں کی بستی ہے۔ یہاں عباسی خلیفہ ہارون رشید کی بیوہ زبیدہ خاتون کا مزار ہے۔ تعمیر شدہ عمارت خاصی بلند اور گنبد فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ مزار کی مناسب دیکھ بھال نہ ہونے سے ویرانی وادای چھائی رہتی ہے۔

مزار منصور الحلاجؒ:

''الشیخ'' کے ایک بازار میں انارکلی لاہور میں واقعہ قطب الدین ایبک کے مزار کی طرح کے محل وقوع پر عن الحق کہنے والے شیخ حسین بن منصور الحلاجؒ کا مزار ہے۔ مزار کی عمارت تعمیر اور تزئین وآرائش کے اعتبار سے قابل دید ہے۔ قبر پر لکڑی کے باکس پر گولڈن رنگ کی چادر ڈالی ہوئی ہے۔

مزار حبیب العجمی داعیؒ:

الشیخ حبیب العجمی داعیؒ کے مزار کے احاطہ میں مسجد بھی ہے۔ مسجد اور مزار دونوں خستہ حالت میں ہیں۔ پلستر اکھڑ کر دراڑیں پڑ چکی ہیں۔

مزار السید البشر الحافیؒ:

اردگرد کھجوروں کے پھل سے لدے ہوئے درختوں میں السید البشر الحافیؒ اور حضرت ابوبکر شبلیؒ کے مزار بھی اسی قبرستان کے وسط میں واقع ہیں۔ جن کی مناسب دیکھ بھال جاری ہے اور مقامی لوگوں سے زیادہ بیرونی وفود حاضری کے لئے آتے ہیں۔

مزار حضرت امام غزالیؒ:

حضرت امام غزالیؒ کا مزار ایک ایسے علاقہ میں ہے جہاں بہت سارے لکڑی کے ٹال ہیں۔ چھوٹی سی چاردیواری کے اندر پہلے برآمدہ ہے پھر چھوٹے سے کمرہ میں امام غزالیؒ آسودہ خاک ہیں۔ قبر کے اردگرد ڈیڑھ فٹ اونچی لکڑی کی باؤنڈری ہے اور لکڑی ہی کی

سریک ہے جس کے اوپر سبز اور سنہری رنگ کی چادر بچھی ہوئی ہے۔ مزار کا ماحول اور حالت اس امام کی عظمت اور خدمات کے مقابلہ میں قابل غور وفکر ہے۔

مزار حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ :

بغداد سے 30 کلومیٹر کے فاصلہ پر شہر مدائن جو اب ''سلمان پاک'' کہلاتا ہے واقع ہے۔ یہاں صحابی رسول حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مزار اقدس ہے۔ یہ وہی صحابی رسول ہیں جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''سلمان میرے اہل بیت رضی اللہ عنہم میں سے ہے۔'' حضرت سلمان رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اسی شہر مدائن کے گورنر بھی مقرر ہوئے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے 130 سال عمر پائی اور 655ھ میں آپ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ کا مزار وسیع احاطہ میں واقع ہے۔ عمارت پر بہت بڑا گنبد ہے اور اردگرد متعدد کمرے بنے ہوئے ہیں۔ مزار سے ملحقہ مسجد بہت خوبصورت ہے جس کا مینار خاصا بلند ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے مزار کے اندر قبر بالکل سادہ ہے جس پر سبز رنگ کی چادر پڑی ہے۔ بائیں جانب خستہ حال چھت کے نیچے چند اور قبریں ہیں۔ ایک گنبد کے نیچے حضرت حذیفہ الیمان رضی اللہ عنہ اور امام طاہر بن زید العابدین رضی اللہ عنہ کی قبریں ہیں جن پر سبز رنگ کی چادریں ہیں۔

''سلمان پاک'' میں عراقی حکومت نے ایک پینوراما تعمیر کروایا ہے جس پر 55 ملین عراقی دینار خرچ ہوئے ہیں۔ اسے کوریا کے انجینئرز نے ڈیزائن اور تعمیر کیا ہے جنہوں نے کمال مہارت سے جدید اور عالیشان عمارت تعمیر کی ہے۔ پینوراما میں عجائب گھر بھی ہے۔ بالائی منزل میں 16 ہجری میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی زیرکمان مسلمان اور ایرانیوں کے درمیان لڑی جانے والی جنگ قادسیہ کا روشنی اور آواز کی مدد سے نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی تھی۔

مزار سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ :

نجف اشرف میں سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مزار انور وسیع رقبے پر واقع ہے۔ آپ کی جائے تدفین سے متعلق مختلف روایات ہیں اور گیارہ مختلف جگہوں پر آپ رضی اللہ عنہ کے

جسد خاکی کے مدفون ہونے کا بیان کیا جاتا ہے۔ افغانستان میں مزار شریف کی جگہ پر بھی آپ رضی اللہ عنہ کی آخری آرامگاہ بتائی جاتی ہے جہاں نہایت عالیشان عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ شام وغیرہ میں بھی آپ کی تدفین کا بتایا جاتا ہے لیکن محققین کے مطابق نجف میں چوتھے خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک سب سے پہلے داؤد بن علی العباس نے 750ء (139ھ) میں دریافت کی۔ اس کے بعد عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے نجف کے علاقہ میں شکار کھیلنے کے دوران ''القوات'' نامی جگہ جو تین پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی رک کر 786ء (175ھ) کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر کی نشاندہی کی اور یہ وہی جگہ ہے جہاں آج آپ رضی اللہ عنہ کا عالیشان مزار مرجع خلائق ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے سب سے پہلے آپ رضی اللہ عنہ کے مزار پر سرخ رنگ کی اینٹوں کا گنبد تعمیر کروایا۔ اس کے بعد آنے والے خلفاء و امراء نے مزار کی عمارت کو آپ رضی اللہ عنہ کی ہستی کے شایانِ شان بنانے کے لئے خوبصورت اور جدید تعمیرات کروائیں۔ آج آپ رضی اللہ عنہ کے مزار کے گنبدوں، میناروں اور دیگر جگہوں پر تزئین و آرائش کے لئے منوں کے حساب سے سونے کا استعمال نظر آتا ہے۔

مرکزی عمارت کے چاروں طرف بڑے بڑے دروازے ہیں جن میں سے سامنے بائیں اور عقبی دروازے احاطہ میں داخلہ کے لئے زیادہ استعمال ہوتے ہیں جب کہ دائیں جانب سڑک پر کھلنے والا دروازہ بند رہتا ہے۔

شام کے بعد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مزار میں زائرین جن میں خواتین اور بچے زیادہ ہوتے ہیں کا رش ہوتا ہے۔ احاطہ کی فصیل نما دیوار کے باہر ہمہ وقت ملنگ خواتین و حضرات ڈیرہ جمائے ہوتے ہیں۔

جامع مسجد کوفہ جہاں خلیفہ چہارم کی شہادت ہوئی:

کوفہ جسے عربی زبان میں ''الکوفہ'' کہتے ہیں کو اسلامی تاریخ میں بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس شہر کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے آباد کیا تھا۔ کوفہ شہر کو خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ نے 36ھ میں اسلامی ریاست کا دارالخلافہ

بنایا تھا۔

لاہور کے شاہی قلعہ کی طرز کی بڑی سی فصیل میں واقع مسجد کوفہ کی جامع مسجد کہلاتی ہے۔جس میں داخلہ کے لئے شمالی دروازہ استعمال ہوتا ہے۔

کوفہ کی یہ جامع مسجد عراق میں جامع مسجد بصرہ کے بعد دوسری سب سے بڑی مسجد ہے۔موجودہ جامع مسجد کوفہ شہر کی سب سے بڑی مسجد کی جگہ پر تعمیر کی گئی ہے جسے قدیم مسجد کی طرز پر ہی تعمیر کیا گیا ہے اور قدیم عمارت کو 28 سیمی سرکلر ٹاورز کی مدد سے قائم کیا گیا ہے۔ مسجد میں متعدد کوریڈور اور گنبد ہیں۔ ایک گنبد عین اس جگہ واقع ہے جہاں فجر کی نماز کے وقت ایک بدبخت عبدالرحمٰن ابن ملجم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خنجر کے وار سے شدید زخمی کیا تھا اور آپ رضی اللہ عنہ نے دو روز موت وحیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا تھا۔

مزار حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ:

حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ، مختار سکشی رضی اللہ عنہ (جو کربلا میں شہید ہوئے تھے) صحابی رسول حضرت ہانی بن عروہ رضی اللہ عنہ (جنہوں نے حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی) اور حضرت خدیجہ بنت علی رضی اللہ عنہ کے مزارات بھی اسی تاریخی مسجد کے احاطہ میں واقع ہیں۔مختار سکشی رضی اللہ عنہ کی قبر حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کے مزار کے اندر ایک کونے میں واقع ہے۔

ان مزارات پر بڑے بڑے اور خوبصورت گنبد ہیں جن کی تزئین وآرائش کا کام مختلف مراحل میں جاری رہتا ہے۔

مسجد کے احاطہ میں ایک گنبد ''ہاؤس آف گورنمنٹ'' کی عمارت کے اوپر ہے جو عباسی اور اموی دور خلافت میں حکومتی نظم ونسق کا مرکز تھا۔

طوفانِ نوح علیہ السلام کا کنواں:

جامع مسجد کوفہ کے وسیع کچے صحن میں ایک جگہ گولائی میں لوہے کی چند سلاخیں ہیں۔اس جگہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ وہی تندور ہے جہاں سے طوفان نوح علیہ السلام برآمد ہوا تھا۔کنواں کی گہرائی تو بالکل نہیں البتہ گولائی میں لوہے کی سلاخیں ہی اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں۔

بیت المشرف:

بیت المشرف (حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گھر) جامع مسجد کے جنوب میں بالکل ساتھ ہی واقع ہے۔ کچی دیواریوں اور چند کمروں پر مشتمل یہ گھر صدیوں پرانا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کا گورنر بننے کے بعد یہاں سکونت اختیار کی تھی۔ حضرت امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما نے یہاں پرورش پائی تھی۔

گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں جن پر بیت العائلہ، محل الکفن اور غسل کی تختیاں لگی ہیں۔ آگے جا کر ایک چھوٹا سا کنواں ہے جس سے پانی نکال کر سرکاری خادمین زائرین کو پلاتے ہیں۔

ایک چھوٹے سے کمرہ پر مکتبہ حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی تختی لگائی گئی ہے۔ اندر چند کتب بھی رکھی ہیں اور کوئی چیز نہیں ہے۔

مسجد حنانا:

بیت المشرف سے کچھ فاصلہ پر ''مسجد حنانا'' ہے۔ اس مسجد اور جگہ کی اہمیت یہ ہے کہ کربلا میں شہید کرنے کے بعد امام عالی مقام حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا تن سے جدا کیا ہوا سر مبارک کچھ دیر کے لئے یہاں رکھا گیا تھا۔ مسجد حنانا زیادہ بڑی تو نہیں مگر اس پر گنبد بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

مزارات حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام:

نجف کے مرکزی قبرستان میں تاحد نظر قبریں ہیں۔ بہت بڑا قبرستان ہے جہاں دو انبیاء کرام حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کے مزارات ہیں۔ مزارات تک سڑک سے کافی دور پیدل چل کر جانا پڑتا ہے۔ مزارات سادہ سی عمارات میں ہیں۔ اردگرد زیادہ تر ان نوجوانوں کی قبریں ہیں جو جنگوں میں جاں بحق ہوئے اور اکثر قبروں پر تصاویر رکھی نظر آتی ہیں۔

مزار حضرت حرؒ:

کربلا کے راستہ میں پہلا مزار حضرت حرؒ کا ہے۔ جو کربلا کے معرکہ حق و باطل میں میدان میں عین لڑائی کے وقت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے آ ملے تھے۔ سڑک کے کنارے دائیں جانب مزار کی نمایاں عمارت واقع ہے۔ تزئین و آرائش اچھی خاصی ہے اور عمارت کا اندرونی حصہ خاصا روشن ہے۔

مزار امام عالی مقام حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہما :

کربلا معلیٰ میں امام عالی مقام حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس علمدار رضی اللہ عنہ کے مزارات کی پرشکوہ عمارات کے درمیان 300 میٹر کا فاصلہ ہے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے مزار کی عمارت عالیشان ہے اور مرکزی دروازہ سے داخلہ کے بعد آپ رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک ہے پھر بائیں جانب آپ رضی اللہ عنہ کے 120 جانثاروں کے ناموں کی خوبصورت تختیاں لگی ہوئی ہیں جو یہاں مدفون ہیں۔

جنوب میں مزار کے اندر داخلہ کا جو دروازہ ہے اس کے بائیں جانب چھوٹا سا دروازہ ہے جو نیچے اترائی کا ہے۔ اس جگہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اس مقام پر شہید ہوئے تھے۔ اس جگہ ایک خاص قسم کا سنگ مرمر چاروں طرف لگایا گیا ہے جس سے بکھرے خون اور دھبوں کا احساس ہوتا ہے۔

مزار کے اندر ہی عقب میں شمال مغرب میں حضرت السید ابراہیم المجاب رضی اللہ عنہ کا مزار ہے جو امام حسین رضی اللہ عنہ کے مقامی خادم تھے۔ اسی طرح ایک اور شہید خادم حبیب بن مظاہر الاسدی رضی اللہ عنہ کا مزار بیرونی برآمدہ میں ہے۔

امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کے روضہ و مزار کی پوری عمارت میں خطاطی اور آرٹ کا دلکش اور حیرت انگیز مظاہرہ کیا گیا ہے۔ روح پرور ماحول اور ایمان افروز کیفیت میں آج سے ہزاروں سال قبل کربلا کے اسی میدان میں (680ء) 10 محرم 61ھ کو ہونے والے معرکہ حق و باطل کا منظر و نقشہ ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ امام عالی

مقام اور اہل بیت رضی اللہ عنہم پر مظالم کی انتہاء کرنے والوں کا نام ونشان مٹ چکا ہے اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا نام اور ان کا کردار وعظمت آج بھی پوری آب وتاب سے زندہ ہے اور متلاشیانِ حق کے لئے رہتی دُنیا تک باعث تقلید رہے گی۔

چبوترہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا :

مزار امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کے باہر پچھلی جانب ایک گنبد والا کمرہ ہے جو اونچائی پر واقع ہے۔ اس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ وہ چبوترہ ہے جہاں سے حضرت بی بی زینب رضی اللہ عنہا جنگ کا منظر دیکھتی تھیں۔

علامتی خیمہ گاہ اہل بیت رضی اللہ عنہم :

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے مزار کے جنوب میں کچھ فاصلے پر ایک حویلی ہے جس کا بیرونی دروازہ کافی بلندی پر ہے۔ دیواروں کے اندر معرکہ کربلا میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کے خیموں کی جگہوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ چبوترہ سے میدانِ جنگ کا منظر دیکھ کر حضرت بی بی زینب رضی اللہ عنہا ان خیموں میں خبر لاتی تھیں۔

مزار حضرت عباس علمدار رضی اللہ عنہ :

کربلا کی شدید گرمی میں حضرت عباس علمدار رضی اللہ عنہ کے پرشکوہ مزار کی عمارت میں سکون کی گھڑی غنیمت ہوتی ہے۔ مزار کا اُجلا اور پُرکیف ماحول روحانی تقویت کا باعث ہوتا ہے۔ مزار کے گنبد و مینار پر سونے کا کام ہوا ہے اور حکومت کی طرف سے مزار کی خصوصی تعمیر و مرمت اور دیکھ بھال کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

مزار حضرت عون بن عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہم :

کربلا بغداد روڈ پر 20 کلومیٹر کے فاصلہ پر سڑک کے دائیں جانب حضرت عون بن عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہم کا مزار ہے۔ قبر چھوٹے سے کمرہ میں ہے جس کے سامنے برآمدہ ہے۔

مزارات حضرت محمد اور حضرت مسلم رضی اللہ عنہما :

کربلا بغداد شہراہ پر 50 کلومیٹر پر حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد رضی اللہ عنہ اور مسلم رضی اللہ عنہ کے مزارات ہیں۔ وسیع چاردیواری میں بڑے گنبد پر سبز رنگ کی ٹائلز اور باہر بڑا گیٹ ہے۔ عمارت پر دلکش نقاشی نظر آتی ہے۔ مزارات کے گرد چھوٹی سی بستی بھی واقع ہے۔

ہاروت و ماروت فرشتوں کا کنواں:

بغداد میں سٹی سے نکلنے کے بعد نجف روڈ پر بابل کے کھنڈرات واقع ہیں۔ جہاں ہزاروں سال پرانی تہذیب کے نوادرات اور تصاویر کے مونو پرنٹس ایک بڑے عجائب گھر کی زینت ہیں۔ ان کھنڈرات میں ایک چھ ہزار سال پرانی سڑک بھی ہے جس پر بیس گھوڑے برابر دوڑ سکتے تھے۔ یہاں وہ چھوٹا سا کنواں بھی موجود ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے دو فرشتے ہاروت و ماروت بطور سزا الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔

مقام ابراہیم علیہ السلام:

بابل سے بیس کلومیٹر کی مسافت پر سڑک سے چار کلومیٹر دور دائیں جانب مغرب میں وہ تاریخی مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ دور سے یہ علاقہ میدان ہی نظر آتا ہے۔

حضرت ابی بکر رضی اللہ عنہ کا مزار:

بغداد نجف روڈ پر مقام ابراہیم علیہ السلام سے تھوڑا سا آگے چل کر ایک قبرستان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت ابی بکر رضی اللہ عنہ کا مزار واقع ہے۔ قبرستان کے اندر اس مزار میں زیادہ آمد و رفت نہیں ہے اور آبادی سے دُور ہے۔

مزار حضرت ایوب علیہ السلام:

''حلہ'' میں سڑک کے بائیں جانب حضرت ایوب علیہ السلام کا مزار ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے وہ پیغمبر تھے جن کا صبر تاریخ میں بہت مشہور ہوا۔ سادہ سی عمارت کے گرد کھجور کے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ چھوٹے سائز کے کمرہ میں تعمیر شدہ قبر پر چپس لگی ہے۔ اردگرد

پائپ کا جنگلا اور اوپر سبز رنگ کی چادر پڑی ہوئی نظر آتی ہے۔

مزار حضرت ذوالکفل علیہ السلام:

''الکفل'' نامی قصبہ میں تاریخی مقام خضر واقع ہے۔ مقام خضر دراصل ایک قدیم ترین عبادت گاہ ہے اور یہاں حضرت ذوالکفل علیہ السلام کا مزار ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ کے 14ویں پیغمبر تھے۔ مزار پر لکڑی کا باکس ہے۔ اوپر قدیم طرز کا مگر منفرد گنبد ہے۔ دائیں جانب اصحاب النبی علیہ السلام کی 5 قبریں ہیں جن پر سبز رنگ کی چادریں ہیں۔ ان اصحاب النبی کے نام یاروخ، یوسف الربان، یوشع، خون ناقل التوراہ اور یوحنا الاپلچی ہیں۔ عظمت رفتہ کی غماز پرشکوہ عمارت زمانے کی شکست وریخت کا شکار ہے۔ عمارت میں بوسیدگی کے باوجود بے شمار محرابیں ہیں۔ دیواروں اور دروازوں پر نقاشی کے قدیم نمونے سیاہ پڑنے کے علاوہ کہیں کہیں سے اُڑ چکے ہیں۔ دیواروں پر عبرانی زبان میں کتبے کندہ ہیں۔ مزار کی عمارت کے باہر یہودیوں کی دینی درسگاہ اور مکتبہ کے کھنڈرات ہیں۔ یہ یہودیوں کی تعمیر کردہ عمارت تھی جہاں ان کے بچے دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اولین قبلہ بیت المقدس کی نشاندہی بھی موجود ہے۔

مقام یونس علیہ السلام :

موصل شہر میں حضرت یونس علیہ السلام کے حوالے سے ایک عمارت پہاڑی سی اونچائی پر واقع ہے۔ یہ جگہ دراصل حضرت یونس علیہ السلام کی عبادت گاہ تھی اور یہاں لوگوں نے اس نظریہ سے عمارت تعمیر کر دی کہ یہاں حضرت یونس علیہ السلام کی قبر ہے حالانکہ آپ بیت المقدس میں مدفون ہیں۔ اس عمارت کے مرکزی دروازہ تک پہنچنے کے لئے 115 سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں جب کہ 25 سے زائد سیڑھیاں جائے عبادت اور ملحقہ مسجد تک ہیں۔ یہ جگہ اتنی بلندی پر واقع ہے کہ پورے موصل شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

مزار حضرت شیث علیہ السلام:

حضرت شیث علیہ السلام کا مزار موصل شہر کے اندر قدیم عمارتوں میں گھرے علاقہ میں واقع

ہے۔ آپ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے تھے اور آپ نے 1057 سال عمر پائی۔ مزار کی عمارت خاصی بڑی ہے جس میں سنگ مرمر پر قرآنی آیات کی دلکش خطاطی ہے۔ قبر پر سبز رنگ کی چادر ہے۔ مزار سے ملحقہ مسجد بھی بہت عمدہ ہے اور اس کے صحن میں الگ تھلگ خاصا بلند مینار ہے جو 1406ھ کا بنا ہوا ہے۔

مزار حضرت جرجیش علیہ السلام :

موصل کے ''عموالبقال'' کے علاقہ میں سڑک کے کنارے ایک چادر دیواری میں حضرت جرجیش علیہ السلام کا مزار اقدس ہے۔ پہلے مسجد واقع ہے جس کی تعمیر کا حسن نمایاں نظر آتا ہے۔ قبر گہرائی میں واقع ہے جس کے اوپر لکڑی کا تابوت ہے جس کے چار پائے بھی ہیں۔ تابوت کی لکڑی پرانی ہو چکی ہے اور اس پر آیات کندہ ہیں۔ اندر شیشے کا ایک کور نظر آتا ہے۔ مزار کی یہ جگہ تنگ ہے جہاں دو تین سے زیادہ افراد ٹھہر نہیں سکتے۔

مزار کے اندر بائیں دیوار میں ایک جگہ موٹا شیشہ لگا ہوا ہے۔ جہاں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک محفوظ ہیں جنہیں زائرین عقیدت سے بوسہ دیتے ہیں۔ یہ موئے مبارک واضح نظر نہیں آتے۔ مزار کی پوری عمارت پر پرانی طرز کا گنبد بھی ہے۔

مزار حضرت دانیال علیہ السلام :

موصل کے علاقہ حیی الشفاء میں تنگ گلیوں میں حضرت دانیال علیہ السلام کا مزار انور واقع ہے۔ حضرت دانیال علیہ السلام خواب کی تعبیر سب سے مستند بتاتے تھے۔ آپ علیہ السلام کے مزار کی عمارت رہائشی مکانات میں گھری ہوئی ہے۔ مزار کی تعمیر نو مقامی محکمہ اوقاف نے 1401ھ میں کروائی تھی۔ لوہے کے جنگلے سے نیچے اتر کر قبر تک جانا پڑتا ہے۔ قبر پر چادر ہے اور اردگرد قالین بچھے ہیں۔ نیچے دوسری طرف کنواں ہے جس کے متعلق روایت ہے کہ حضرت دانیال علیہ السلام کی قبر اصل جگہ سے پھسل کر کنواں میں چلی گئی ہے۔

مزار الشیخ قضیب البان الموصلیؒ:

حضرت سری سقطیؒ اور جنید بغدادیؒ کے ہمعصر اور موصل کے بہت بڑے بزرگ الشیخ

قضیب البنان الموصلیؒ اور ان کی ہمشیرہ کے مزارات ایک چاردیواری میں واقع ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت غوث اعظمؒ کے بیٹے عیسیٰ بن شیخ عبدالقادر اور موسیٰ بن شیخ عبدالقادر بھی اسی احاطہ میں مدفون ہیں۔ اس مزارات سے ملحقہ ایک خوبصورت مسجد بھی ہے۔

مزار حضرت شیخ فتح موصلیؒ:

حضرت شیخ فتح موصلیؒ کا مزار بھی موصل کے ایک کھلے علاقہ میں واقع ہے۔ فتح موصلیؒ حضرت معروف کرخیؒ کے ہمعصر تھے اور ان کے بارے میں مشہور تھا کہ جو بات بھی کہتے پوری ہوتی تھی۔ آپؒ کا مزار چاردیواری میں ہے۔ قدیم اور خستہ حال عمارت میں دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ لوہے اور لکڑی کے یکے بعد دیگرے تین دروازے ہیں جن میں سے گذر کر نشیب میں واقع قبر تک پہنچایا جاتا ہے۔ مزار کی عمارت کے اوپر چھوٹا سا گنبد ہے جو سفید رنگ کے پتھر سے بنایا گیا ہے۔

حضرت امام علی نقی رضی اللہ عنہ اور خاندان کے مزارات:

سامرہ شہر بغداد سے 124 کلومیٹر فاصلہ پر صلادین صوبہ میں واقع ہے۔ ''سامرہ'' عباسی دور خلافت میں کچھ عرصہ دارالحکومت بھی رہا۔ اس شہر کو عباسی خلیفہ المستنصر بلا نے 836ء (221ھ) میں تعمیر کروایا تھا۔ سامرہ کا اصل نام ''سرامن رائ'' ہے جس کا مطلب ہے ''جس نے ایک بار دیکھا پھر من چاہا''۔

سامرہ میں حضرت امام علی نقی رضی اللہ عنہ، ان کی ہمشیرہ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا خاتون، حضرت امام حسین بن علی نقی رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ نرجس رضی اللہ عنہا خاتون کے مزارات ایک پرشکوہ عمارت میں واقع ہیں۔ عمارت کے مرکزی دروازہ پر دو مینار ہیں جن کی اونچائی 36 میٹر ہیا ور ان پر سونا لگا ہوا ہے۔ رات کو عمارت کا نظارہ قابل دید ہوتا ہے۔ حضرت علی نقی رضی اللہ عنہ جن کا پورا نام امام علی الہادی بن محمد الجواد ہے کا انتقال 858ء (254ھ) میں ہوا تھا۔ ان کے بیٹے الحسن العسکری کی قبریں ایک ہی گنبد تلے ہیں۔ اس عالیشان گنبد کی چوڑائی و گولائی 68 میٹر ہے اور اس پر سونے کی 72000 اینٹیں لگی ہوئی ہیں۔ اوپر سرخ رنگ کا پرچم لہراتا رہتا ہے۔ تھوڑے

فاصلے پر دونوں بیبیوں کے مزارات ہیں جن پر سبز نیلے رنگ کا بڑا گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے یہ گنبد ناصرالدولہ الحمدانی نے 945ء (333ھ) میں تعمیر کروائے تھے۔ اس نے مزارات کے گرد مضبوط چار دیواری بھی بنوائی۔ بعد میں عباسی خلیفہ المستنصر باللہ نے گنبد کے لکڑی کے باکس کو تبدیل کر کے ساگوان کی لکڑی کے نئے باکس لگوا دیئے۔ اس نے مزار اور چار دیواری کی تزئین و آرائش بھی کروائی تھی۔

ان کے بعد خلیفہ ناصرالدین اللہ نے مزارات پر کچھ نئی تعمیرات کروائیں۔ مزار کی ابتدائی تعمیر اور اس کے بعد کے عرصہ میں تعمیر نو کے علاوہ سب سے زیادہ توجہ 1785ء (1200ھ) میں دی گئی اور موجودہ شکل میں نظر آنے والا گنبد اور مینار اسی دور میں مکمل ہوئے۔ یہ گنبد پوری اسلامی دنیا میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا گنبد ہے اور مینار اپنی مثال آپ ہیں۔

محلات کا مالک

9اپریل 2003ء کو بغداد پر قبضہ مکمل ہونے کے بعد امریکی فوجیوں اور واشنگٹن میں بیٹھے صدر بش کو جس شخص کی شدت سے تلاش تھی وہ عراق کے صدر صدام حسین تھے۔ صدر صدام سمیت امریکہ نے پچپن عراقی اعلیٰ عہدیداروں اور جرنیلوں کی فہرست جاری کی تھی جن کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر خطیر امریکی رقم کا انعام رکھا گیا تھا۔ صدر صدام حسین کی گرفتاری کے لئے 25 ملین امریکی ڈالر انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔

امریکی فوجیوں نے اعلیٰ فوجی حکام کی ہدایت پر صدر صدام حسین کی تلاش میں ہر مشتبہ جگہ پر چھاپے مارے، تلاشیاں لیں لیکن مخبروں کی اطلاع پر امریکی فوجیوں نے صدر صدام کے دونوں بیٹوں اودے اور قصے کو ڈھونڈ کر انہیں ہلاک کر دیا۔ کئی ایک جرنیل اور وزراء گرفتار کر لئے گئے مگر صدام حسین آٹھ ماہ کی تلاش کے باوجود ہاتھ نہیں آ سکے تھے۔ 11 دسمبر 2003ء کو امریکی فوجیوں نے تکریت سے ایک مشتبہ عراقی کو گرفتار کیا۔ اس کی گرفتاری بھی مخبر کے ذریعے عمل میں آئی تھی۔ تفتیش کے دوران اس شخص نے انکشاف کیا کہ سابق صدر صدام حسین ایک فارم ہاؤس میں رہے ہیں۔ اس شخص نے دو خفیہ ٹھکانوں کی اطلاع دی تھی جو تکریت کے نواح میں الدور نامی علاقے میں واقع تھے۔

امریکی فوج نے ایک مرتبہ پھر ''آپریشن ہنٹ صدام حسین'' ترتیب دیا اور دونوں مشتبہ ٹھکانوں کو ''وولورائن ون'' اور ''وولورائن ٹو'' کا نام دے کر 13 دسمبر کی رات 6 بجے آپریشن کے لئے پیش قدمی شروع کر دی۔ آپریشن میں منتخب 600 امریکی فوجی شریک تھے۔ جن کی قیادت کرنل جیمز ہیکے کر رہے تھے۔ رات کے اندھیر میں 8 بجے دو مقامات پر حملہ اور تلاشی شروع ہوگئی۔ حسب سابق تمام کونوں کھدروں کی کڑی تلاشی کے باوجود فوجیوں کو اپنا ٹارگٹ

نہ ملا۔ سینئر امریکی فوجی عہدیداروں نے نئے سرے سے سوچ بچار کے بعد علاقہ کی ناکہ بندی کر کے تلاش کے کام کو وسیع کر دیا۔ اس دوران امریکی فوجی ایک کچے مکان کی تلاشی میں مصروف تھے کہ انہیں ایک تہہ خانے کا دروازہ دکھائی دیا۔ اینٹیں، مٹی اور ایک بوسیدہ قالین سے اس راستے کو ڈھانپنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس وقت رات کے آٹھ بج کر چھتیس منٹ ہو چکے تھے۔ فوجی مزید الرٹ ہو گئے اور انہوں نے جیسے ہی قالین اور اینٹیں تہہ خانے کے منہ سے ہٹائیں اور سرچ لائٹس سے اندر دیکھا تو ایک شخص لیٹا ہوا نظر آیا۔ یہ شخص صدام حسین تھا جس نے خود ہی غیر متوقع طور پر ہاتھ اوپر اٹھا کر ہتھیار ڈالنے اور اپنی گرفتاری کا عندیہ دے دیا۔

امریکی فوجیوں کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ سر اور داڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں والا یہ شخص سابق عراقی صدر صدام حسین ہے۔ جس کی تلاش میں وہ ہزاروں چھوٹی بڑی جگہوں پر مارے مارے پھرتے رہے اور وہ اس کسمپرسی کے عالم میں زیرِ زمین لیٹا ہوا مل گیا ہے۔

تہہ خانے سے صدام حسین کو باہر نکالا گیا تو امریکی فوجیوں کے سامنے آتے ہی صدام حسین نے انگریزی میں کہا ''میرا نام صدام حسین ہے میں عراق کا صدر ہوں اور آپ سے مذاکرات کرنا چاہتا ہوں۔''

امریکی فوجی جو اپنی کامیابی پر نازاں تھے انہوں نے مذاق کرتے ہوئے جواب دیا ''صدر بش کی طرف سے آپ کے لئے نیک خواہشات ہیں'' آپ ہمارے ساتھ چلئے اور صدام حسین پریشان چہرے ساتھ فوجیوں کے گھیرے میں باہر آ کر فوجی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

بعد میں امریکی فوجیوں نے تہہ خانے اور مکان کا تفصیلی معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ 6 فٹ گہرے تہہ خانے میں ہوا کے لئے پنکھا اور روشنی کے لئے بلب بھی لگایا گیا تھا۔ اندر صرف اتنی جگہ تھی کہ ایک شخص لیٹ سکتا تھا۔

مکان میں بظاہر نئے اور پرانے کپڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ عراق میں پانی کی شدید کمی کے

باوجود مکان کے چھوٹے سے باورچی خانے میں تازہ پانی آ رہا تھا۔ تازہ پانی کے علاوہ باورچی خانے میں یوں لگتا تھا جیسے کئی دنوں سے صفائی نہیں ہوئی۔ آلودہ پلیٹس، انڈے کے چھلکے، باسی روٹی کے ٹکڑے اور چاول پڑے تھے۔ ایک فریج جو چھوٹے سائز کا تھا میں لیموں کا شربت، چاکلیٹ اور کافی بنانے کا سامان موجود تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ کمرے میں کوئی باتھ روم موجود نہیں تھا اور نہ ہی قرب و جوار میں ایسا کوئی انتظام تھا۔ سوائے اس کے کہ کچھ فاصلے پر ایک گڑھا کھودا گیا تھا۔ صدر صدام حسین کے تہہ خانے سے امریکی فوج نے سات لاکھ پچاس ہزار ڈالرز، دو عدد گن اور ایک بریف کیس برآمد کر لیا۔ عمارت کے باہر کھڑی دو سفید اور پیلی گاڑیاں بھی قبضے میں لے لی گئیں جن کے بارے میں فوجیوں کا خیال ہے کہ صدر صدام حسین انہیں استعمال کرتے تھے۔

24 سال تک عراق کے مطلق العنان حکمران کے طور پر گذارنے والے صدام حسین نے 1991ء میں امریکی و اتحادی حملہ کے بعد اپنے لئے 22 شاندار اور جدید طرز تعمیر کے حامل محلات بنوائے تھے۔ وہ گذشتہ آٹھ ماہ سے روپوشی کے دوران تہہ خانے میں جس کسمپرسی کے ماحول میں رہتے رہے وہ اپنی جگہ عبرت ناک اور سبق آموز ہے۔ 1959ء میں صدام حسین عبدالکریم قاسم جو عراق کے آمر تھے پر قاتلانہ حملہ کرنے والے گروپ میں شامل تھے اور وہ اس کے بعد گرفتاری سے بچ نکلے تھے۔ صدام حسین اس واقعہ کے بعد ایک سال تک ملک کے اندر روپوش رہے اور ملکی سطح پر باوجود کوشش کے انہیں تلاش نہ کیا جا سکا۔ بعدازاں وہ شام فرار ہو گئے تھے۔ لیکن امریکی فوج کے سامنے صدر کی حیثیت سے فرار ہونے کے آٹھ ماہ سے زیادہ روپوشی کی زندگی نہ گذار سکے۔

عراق کی دلدل اور امریکہ

عراق میں صدر صدام حسین کو اقتدار سے الگ کرنے کے لئے امریکہ نے دنیا بھر میں لاکھوں افراد کے احتجاج اور بڑے ممالک کی حکومتوں کے عدم تعاون کے باوجود مارچ 2003ء میں حملہ کیا۔ اپنے اتحادی برطانیہ کے ساتھ مل کر پہلے سے اقتصادی پابندیوں کے باعث تباہ حال ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لاکھوں فوجیوں اور جدید بری، بحری اور فضائی ہتھیاروں اور ٹیکنالوجی سے حملہ کرتے وقت امریکہ نے اعلان کیا کہ وہ عراقی عوام کو ظالم صدر صدام حسین کے جبر سے آزادی دلانے کے لئے اقدام کر رہے ہیں۔

عالمی میڈیا جو امریکہ کی طاقت اور جبر کے زیر اثر تھا اس امریکی حملہ کو عراق امریکہ جنگ قرار دیتا رہا۔ لیکن عراق جیسے اقتصادی طور پر تباہ حال ملک اور امریکہ جیسے طاقت کے نشے میں چور ملک کے درمیان جنگ ہرگز نہیں تھی بلکہ ایک آزاد ملک کے خلاف امریکہ کی کھلی جارحیت تھی جس میں دنیا بھر کی حمایت نہیں نفرت شامل تھی۔ امریکی افواج نے کویت میں اپنے قائم کردہ اڈوں سے ام قصر اور بصرہ سے حملہ شروع کر کے چھ سات ہفتوں میں بغداد پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران جدید ٹیکنالوجی کے حامل امریکی و برطانوی طیاروں نے عراق کے تمام بڑے شہروں کی سویلین آبادیوں پر اندھا دھند بمباری کی۔ لیزر گائیڈڈ میزائل اور کلسٹر بموں کی بارش کر دی جس سے ہزاروں بے گناہ افراد لقمہ اجل بن گئے اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ شہری آبادیوں پر بمباری پر جب دنیا میں احتجاج ہوتا تو امریکی وضاحت میں کہتے کہ غلطی سے بم شہری آبادی پر گرے ہیں۔ یہ کتنی بڑی منافقت ہے اور جھوٹ ہے کہ ایک تو آپ پوری دنیا کی رائے کے خلاف ایک ملک پر محض اس کے تیل کے وسیع ذخائر پر قبضہ کرنے کے لئے طاقت کے بل بوتے پر حملہ کر رہے ہیں اور پھر بے گناہوں پر بم برسا کر کہیں کہ غلطی

سے گر گئے۔ ایسے میں کہاں گئی وہ آپ کی انسانی حقوق کی علمبرداری اور جدید ترین کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے لیس اسلحہ سازی کا دعویٰ۔

سقوط بغداد کے بعد قابض اتحادی فوجوں نے اپنی نگرانی میں سرکاری و پرائیویٹ اداروں، گھروں اور حتیٰ کہ ہسپتالوں سے وہ لوٹ مار کروائی کہ جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

جب بغداد سمیت تمام بڑے عراقی شہروں میں لوٹ مار اور مکمل تباہی ہو چکی تو اتحادی فوجوں نے اس ڈر سے کہ کہیں عدم تحفظ اور بھوک کا شکار عراقی خود ان کے لئے خطرہ نہ بن جائیں پکڑ دھکڑ کی کارروائیاں شروع کر دیں

عراق میں تعمیرِ نو کا کام تو ابھی کاغذات اور باتوں کی حد تک محدود ہے۔ بلند بانگ دعوے کرنے والے امریکی و برطانوی فوجی اور عہدیدار ہزاروں لاکھوں افراد کو روزگار فراہم کرنے اور سرکاری ملازمین کو تنخواہیں تک پوری طرح ادا نہیں کر سکے۔

عراق میں ہزاروں ایسے افراد اور گھرانے ہیں جن کے شوہر، بیوی، بچے، بھائی بہن اور والدین امریکی جارحیت کے دوران بے گناہ مارے گئے اور ان کی املاک تباہ ہو گئیں یا لوٹ لی گئیں۔ وہ امریکہ اور اس کی اتحادی افواج کو بددعائیں دیتے ہیں اور کسمپرسی کے عالم میں زندگی گذار رہے ہیں۔

امریکہ نے عراق پر حملہ کا جو آخری جواز ڈھونڈا تھا کہ عراقی عوام صدر صدام کی حکومت سے تنگ اور نالاں ہیں اور وہ صدام حسین کا اقتدار ختم کر کے وہاں آزادی بحال کریں اور وہاں خوشحالی لائیں گے وہ بھی غلط ثابت ہوا۔ سارے عراقی صدام حسین کے خلاف نہیں تھے اور نہ ہیں۔ یہ بات ان حالات وواقعات سے ثابت ہو رہی ہے جو امریکی و برطانوی قابض افواج عراق کے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔ جیسے جیسے عراق پر اتحادی افواج کے قبضہ کا دورانیہ بڑھ رہا ہے امریکی و برطانوی فوجیوں پر مقامی فدائین کے حملے بڑھ رہے ہیں۔

گذشتہ 2 سال کے قبضہ میں 1600 سے زائد صرف امریکی فوجی مارے جا چکے ہیں۔ ہزاروں زخمی الگ ہیں اور ان اچانک حملوں میں شدت بدستور برقرار ہے جس سے پریشان

ہو کر امریکہ اب دوسرے ممالک کی فوجوں کو معاوضہ دے کر عراق میں تعینات کرنے اور اپنے فوجیوں کو بچانے کے لئے پوری طرح سرگرم عمل ہے۔

عراق میں قابض افواج پر مقامی گروپوں کے حملوں کے بارے میں امریکی کمانڈوز کا کہنا ہے کہ امریکی و برطانوی فوجیوں پر حملہ کرنے والے القاعدہ کے تربیت یافتہ افراد ہیں اور ان کی تعداد 10 ہزار تک ہوسکتی ہے۔ جو منظم انداز سے چن چن کر قابض فوجیوں اور ان کی مدد کرنے والے عراقی سپاہیوں اور فوجیوں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایک طرف جدید اسلحہ سے لیس تربیت یافتہ امریکی و برطانوی فوجی ہیں تو دوسری طرف مٹھی بھر مجاہدین ہیں جن کے پاس محدود اسلحہ ہے اور وہ ایک سپر پاور کے فوجیوں سے ٹکر لے کر انہیں بھاری نقصان پہنچا رہے ہیں۔ عراق میں اس وقت قابض فوجوں سے جو سلوک ہو رہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ دنیا بھر کے جنگی امور اور اقتصادیات کے ماہرین نے خبردار کیا تھا کہ اگر امریکہ نے عراق پر ناقابل فہم الزامات لگا کر حملہ کیا اور صدام حسین کو اقتدار سے ہٹایا تو اسے مقامی لوگوں اور تنظیموں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

تمام بڑے شہروں میں روزگار، تحفظ اور ضروریات زندگی کا مطالبہ کرنے اور پکڑ دھکڑ بند کرنے کا مطالبہ کرنے کے علاوہ امریکیوں سے عراق کا قبضہ ختم کرنے کا مطالبہ کرنے والوں پر قابض افواج تشدد کرتی اور گولیاں برساتی ہے۔ جس سے امریکہ مخالف جذبات اور پرتشدد کارروائیوں میں شدت آنا فطری امر ہے۔

متعدد ممالک کے سفارت خانوں پر حملے اور امریکی اڈوں پر مزاحمتی کارروائیوں نے عراق کی نام نہاد انتظامیہ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ عراق میں متعدد خودکش دھماکوں میں ہزاروں بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کی جانیں جا چکی ہیں۔ کئی واقعات میں تو معصوم بچوں کی بڑی تعداد نشانہ بن چکی ہے۔

عراق میں فدائین کا گروپ امریکیوں کے ساتھ کام کرنے والے اور ان کے لئے مخبر بننے والے افراد کو بطور خاص نشانہ بنا رہا ہے۔ امریکیوں کے ساتھ کام کرنے والے درجنوں

عراقیوں جو انٹیلی جنس خصوصا صدام حسین کے ساتھیوں کی تلاش میں مدد دے رہے تھے یا مترجم کے طور پر امریکیوں کے ساتھ تھے۔ پھر نئی انتظامیہ کے زیرانتظام میونسپل گورنمنٹ میں ملازمین کو بموں سے نشانہ بنانے اور ہلاک کر دینے کی دھمکیاں ملی ہیں۔گذشتہ ماہ امریکی فوجیوں کے مقامی مترجم کے طور پر کام کرنے والے تین عراقیوں کو بغداد میں قتل کر دیا گیا تھا۔

صدرصدام حسین کا آبائی قصبہ تکریت امریکی فوج کی کارروائیوں کا مرکز رہا ہے جہاں فدائین نے دوعراقی مخبروں کو قتل کر دیا۔ ان میں سے ایک شخص نے امریکیوں کو ہتھیاروں کی بھاری مقدار اور مزاحمتی تنظیموں کی بابت معلومات فراہم کی تھیں اسے دن دہاڑے اس کی آٹو ریپیئر شاپ میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

امریکی فوجی آفیسر کا کہنا ہے کہ مزاحمتی گروپوں کی کارروائیوں سے صدام حسین کے قریبی ساتھیوں کی تلاش میں انہیں مشکلات کا سامنا ہے کیوں کہ جو مخبران کے لئے کام کرتے ہیں گروپ پہلے انہیں نشانہ بناتے ہیں۔ اس کے باوجود امریکیوں نے مقامی طور پر مخبروں کی بڑی تعداد کو اپنے ساتھ ملا رکھا ہے جو انہیں اطاعات فراہم کرتے ہیں۔ انہیں اطلاعات پر امریکی فوجیوں نے کئی مقامات پر چھاپے مارے تاکہ صدام حسین کے ساتھیوں کو گرفتار کر سکیں۔ ایک عرصہ تک امریکی کئی مقامات پر صدام حسین کے خاص سگار اور کھانے پینے کی اشیاء برآمد کرنے کے باوجود صدام حسین کو گرفتار نہ کر سکے تھے۔

تکریت میں فدائین صدام نامی گروپ جو صدام حسین کے دور حکومت کے گوریلا فوجیوں پر مشتمل بتایا جاتا ہے سرگرم عمل ہے۔ اس گروپ نے گذشتہ دنوں شہر میں پمفلٹ گرائے جن پر ان کی ہٹ لسٹ پر موجود افراد کے نام تھے۔ ان ناموں میں صدام حسین کے چچازاد بھائیوں کے نام بھی شامل تھے جنہوں نے صدام کے بیٹوں اودے اور قصے کو مروانے میں امریکیوں سے تعاون کیا تھا۔ اس کے علاوہ ابومصعب الزرقاوی گروپ عراق کے تمام بڑے شہروں میں قابض فوج کے خلاف خودکش حملوں سمیت مزاحمتی کارروائیاں کر رہا ہے۔

عراق میں قابض افواج پر مزاحمتی گروپوں کے حملے جس تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور ان میں امریکہ کا جس قدر جانی نقصان ہو رہا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ امریکہ عراق پر حملہ کر کے اور وہاں قابض ہو کر دلدل میں پھنس گیا ہے۔ اسے وہاں سے تیل کے کنوؤں سے بھی مطلوبہ ہدف کے مطابق تیل نہیں مل سکا۔ جو تیل وہ وہاں سے حاصل کر رہا ہے وہ اس کے فوجی اخراجات اور نقصان کے مقابلہ میں ناکافی ہے۔ مقامی طور پر قابض افواج کے خلاف نفرت اور بغاوت سے امریکی حکام بوکھلا گئے ہیں۔ وہ اب عراق میں نظم ونسق کے معاملہ میں اپنی ناکامی کو چھپانے کے لئے کئی ممالک سے درخواست کر چکا ہے کہ وہ اپنی افواج وہاں بھیجیں ان میں پاکستان بھی شامل ہے۔ اس سلسلہ میں اسلامی ممالک کی تنظیم نے اسلامی ممالک سے افواج کو عراق بھیجنے سے منع کر دیا ہے جس پر امریکہ کی خاصی سبکی اور مایوسی سامنے آئی ہے۔ گذشتہ دنوں انتخابات سے عراقی پارلیمنٹ وجود میں آنے اور نئے صدر کے انتخابات کے باوجود عراق میں سیاسی، سماجی ومعاشی طور پر حالات بہتر ہونے کے واضح آثار نظر نہیں آتے کیوں کہ ایران کو حملوں کی مسلسل امریکی دھمکیوں سے عراق میں مسلح مزاحمتی کارروائیاں عراق کے داخلی استحکام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ مزاحمتی گروپوں کے ساتھ ساتھ تمام بڑی سیاسی اور مذہبی پارٹیوں کا مؤقف ومطالبہ ہے کہ امریکی فوجی عراق سے نکل جائیں اور اقتدار مکمل طور پر عراقی عوام اور اس کی انتظامیہ کے حوالے کیا جائے مگر امریکہ نقصان اٹھانے کے باوجود فی الحال ایران سے متعلق اپنے مفادات حاصل کئے بغیر عراق سے نکلنے کا اقدام نہیں کرے گا۔

تاریخی معلومات سے بھرپور سفرنامہ

''سرزمینِ خاک وخون'' ایران اور شام کی زیارت پر مشتمل سفرنامہ ہے جو نوجوان صحافی سیّد اعجاز گیلانی نے امریکا اور اس کے اتحادیوں کے عراق پر کیے جانے والے ''آپریشن ڈیزرٹ اسٹارم'' کے بعد کیا لیکن جب کتاب شائع ہونے کا عمل شروع ہوا تب امریکا دوبارہ عراق پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس پر انھوں نے کتاب میں عراق کے بارے میں تاریخی معلومات اور دیگر معلومات کو بھی شامل کر دیا ہے جس سے یہ کتاب بیک وقت سفرنامہ کا لطف بھی دیتی ہے اور ایران وعراق کے ماضی سے بھی جڑی معلومات فراہم کرتی نظر آتی ہے۔ سیّد اعجاز گیلانی کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: ''جس طرح انسانوں کی تقدیر ہوتی ہے۔ لگتا ہے اسی طرح عراق کی بھی تقدیر میں بار بار اُجڑنا لکھا ہے۔ اس لیے میں اسے سرزمینِ خاک وخون لکھنے پر مجبور ہوا ہوں۔''

سیّد اعجاز گیلانی چونکہ پیشہ صحافت سے وابستہ ہیں۔ اس لیے انھوں نے نہ تو سفرنامہ کو ادبی چاشنی دی ہے اور نہ ہی اندھی عقیدت میں سفر میں سامنے آنے والے مسائل کو نظر انداز کیا ہے۔ یہ سفرنامہ ایک سیدھی سادھی تحریر ہے جس میں ایران اور عراق کی تہذیب، پابندیوں کے بعد ان ممالک کی معاشرتی صورتحال، پاکستانیوں کے بارے میں ان کے تصورات کو بے ساختہ انداز میں بیان کر دیا گیا۔ ساتھ میں زیارات کی رنگین تصاویر بھی شامل ہیں۔ ایران وعراق کی زیارات کے حوالے سے بہت سے سفرنامے پڑھنے کو ملتے ہیں جس میں قلبی وارداتوں کا ذکر تو بڑی خوبی سے کیا ہوتا ہے لیکن ظاہری حالات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جس سے دونوں مسلمان ملکوں کے اندرونی حالات سے بیگانگی کا تاثر برقرار رہتا ہے۔ سیّد اعجاز گیلانی کے سفرنامے میں قلب اور ذہن دونوں کھلے ملتے ہیں۔ کتاب کا فلیپ سینئر صحافی علی سفیان آفاقی اور ظہیر احمد بابر نے لکھا ہے اور دیباچے ڈاکٹر انور سدید، سعید بدر اور سیّد ارشد حسین گیلانی نے لکھے ہیں۔

''روزنامہ ایکسپریس لاہور''

دلچسپ سفرنامہ

سید اعجاز گیلانی کا زیرِنظر سفرنامہ سفرزمین خاک وخون ماضی و حال کے واقعات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے عراق کی تازہ ترین صورتحال کے علاوہ اس ملک کی تاریخ، جغرافیہ اور ثقافتی روایات کا بھی جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے محض مشاہدات ہی رقم نہیں کیے بلکہ ایک صحافی کی حیثیت سے اپنے تاثرات بھی بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ ان کے سفر کا ماجرا بھی بہت دلچسپ ہے جس میں انہوں نے ہر مقام کی تفصیل کے ساتھ نقشہ کشی کی ہے اور قاری کی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ مقامات مقدسہ کی زیارات کا احوال بھی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ اندازِ تحریر دلکش اور روانی میں ہے جس میں شگفتگی کا عنصر بھی شامل ہے۔ انھوں نے سفرنامے کو بلاوجہ پھیلانے سے احتراز کیا ہے۔ ایک ادیب اور صحافی کی حیثیت سے انھوں نے اپنے سفرنامے کو دوآتشہ بنادیا ہے۔ سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے علاوہ سفرناموں کے شوقین قارئین اور تاریخ و مذہب کے حوالے سے بھی اس میں کافی مواد فراہم کیا گیا ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور طباعت وپیشکش معیاری ہے۔

روزنامہ ''نوائے وقت لاہور'

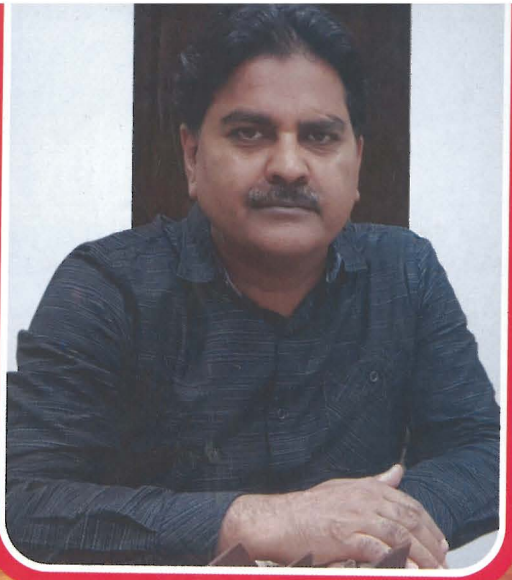

سید اعجاز گیلانی نے ۸۰ کی دہائی میں 'گلستان ادبی سوسائٹی' چونیاں ضلع قصور کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۸۳ میں بچوں کے میگزین "گلستان" کا اجراء کیا اور بطور چیف ایڈیٹر کام کیا۔ ۱۹۸۷ سے ۲۰۰۰ تک ماہنامہ ساحل رنگ قصور کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ذمہ داریاں سرانجام دیں۔ ضلع قصور کی ممتاز سماجی تنظیم عوامی ثقافتی انجمن سے بطور ڈائریکٹر انفارمیشن اینڈ پبلی کیشنز منسلک ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی سے پنجابی زبان و ادب میں ایم اے کیا۔ روزنامہ امروز، مشرق اور جنگ لاہور کے میگزین آرٹیکل رائیٹر کے علاوہ روزنامہ جرآت اور نوائے وقت لاہور کے فیملی میگزین سے بطور سب ایڈیٹر / فیچر رائٹر وابستہ رہے ہیں۔ انگریزی اخبارات دی نیوز لاہور اور دی فرنٹیر پوسٹ لاہور کے لئے بطور کارسپانڈنٹ کئی سال کام کیا۔

اے این ایف کے ۱۰۰ این جی اوز نیٹ ورک پنجاب کے ضلع قصور کے صدر رہے۔ علامہ اقبال میڈیکل کالج / جناح ہسپتال لاہور کے اولین پی آر او / میڈیا کو آرڈینیٹر کے طور پر کام کیا۔ ایسوسی ایشن آف پاکستانی کینیڈینز ونی پیگ مینی ٹوبہ کے ڈائریکٹر میڈیا اینڈ پبلک ریلشنز ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ ابلاغیات میں وزٹنگ لیکچرار اور ۴۹ نیوز سے ڈائریکٹر نیوز وابستہ ہیں جہاں پنجابی پروگرام گلاں وچوں گل بھی کرتے ہیں۔ چار دیگر کتب۔ دور کے ڈھول سہانے، باتوں کے رنگ، دنیا کی امید پاکستان اور منتخب مضامین اور اداریئے بھی شائع ہو چکے ہیں۔